ذکرِ عبدالحق

برادرم صدیق جاوید صاحب کی خدمت میں
معین
اگست ۱۹۷۵ء

ذکرِ عبدالحق

○

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لائل پور

○

سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اُردو بازار لاہور

بار اوّل : ۱۹۷۵ء
نیاز احمد
نے منظور پرنٹنگ پریس لاہور
سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت : -/۱۵ روپے

مُندرجات :

		صفحہ
دیباچہ	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۹
حرفِ مُعتبر	مولانا عبدالماجد دریابادی	۱۵
تاریخِ وفات بابائے اُردو	مولانا حامد حسن قادری	۱۶
سالِ تاریخِ حادثۂ وفات بابائے اُردو		
مُستخرجہ :	مولانا سید ہاشمی فرید آبادی	۱۷
نظم کردہ :	حضرت رئیس امروہوی	

حیاتِ عبدالحق (سوانحی خاکہ) :

		صفحہ
۱ - مولد، تاریخ ولادت، نسب، خاندان :	۱۸۷۰ء	۲۱
۲ - طالب علمی کا زمانہ — علی گڑھ میں ورود :	۱۸۸۸ء	۲۷
۳ - انجمن ترقیٔ اُردو سے تعلق :	۱۹۱۲ء	۴۳
۴ - بحیثیت "مُعتمدِ انجمن" دکن میں :	۱۹۱۲ء — ۱۹۳۶ء	۴۹
۵ - اُردو کی اشاعت و مدافعت میں جہاد :	۱۹۳۷ء — ۱۹۴۷ء	۶۱
۶ - مولوی عبدالحق اور انجمن کی ہجرت :	۱۹۴۷ء — ۱۹۴۸ء	۷۵
۷ - پاکستان میں ابتدائی بے سروسامانی :	۱۹۴۹ء — ۱۹۵۴ء	۹۱
۸ - مردم گزیدہ مولوی عبدالحق :	۱۹۵۵ء — ۱۹۵۸ء	۱۰۷
۹ - مولوی عبدالحق : اِنقلاب ۱۹۵۸ء تا اِنتقال ۱۹۶۱ء		۱۱۷
۱۰ - اِشاریۂ تصانیفِ عبدالحق :	۱۹۰۱ء — ۱۹۶۱ء	۱۲۵

		صفحہ
ذکرِ عبدُالحق (سیرت و شخصیت) "چند ہم عصر" کے آئینے میں		۱۳۳
ضمیمہ :	بابائے اُردو کی ایک نادر قلمی تحریر مع عکس :	۱۸۹
توضیحات :		۲۰۴

پند و نصائح اِس قدر مُفید نہیں ہوتیں، جس قدر
اُن لوگوں کے تذکرے جو خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے
وہ صرف باتیں ہیں اور یہ کام، وہ صرف مُردہ الفاظ
ہیں، اور یہ زندہ اعمال —

—— بابائے اُردو

عالمِ بے مثال اور بابائے اُردو کے ہمدمِ خاص

برادرِ گرامی قدر

ڈاکٹر شوکت سبزواری

— کی یاد میں —

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ایم اے، پی ایچ ڈی

مشاغل :

ریسرچ اسکالر، ترقی اُردو بورڈ، کراچی — ۱۹۶۳ء — ۱۹۶۴ء

لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج بہاول نگر — ۱۹۶۴ء — ۱۹۶۵ء

لیکچرار شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور — ۱۹۶۵ء — ۱۹۶۶ء

لیکچرار شعبۂ اُردو، ایف سی کالج، لاہور — ۱۹۶۶ء — ۱۹۷۳ء

موجودہ مصروفیت :

وائس پرنسپل، پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج لائل پور

تصنیفات و تالیفات :

۱۔ بابائے اُردو — احوال و افکار — ۱۹۶۴ء

۲۔ سیّد وقار عظیم — سوانحی خاکہ — ۱۹۶۷ء

۳۔ خیارستان، (ترتیب مع مقدمہ) — ۱۹۶۸ء

۴۔ نقدِ عبدالحق — ۱۹۶۸ء

۵۔ اشاریۂ غالب [1] — ۱۹۶۹ء

۶۔ مطالعۂ یلدرم [2] — ۱۹۷۱ء

۷۔ غالبیات کا تحقیقی مطالعہ [3] — ۱۹۷۲ء

۸۔ غالب اور انقلاب ستاون [4] — ۱۹۷۴ء

۹۔ آپ بیتی : رشید احمد صدیقی — ۱۹۷۴ء

۱۰۔ ذکرِ عبدالحق — ۱۹۷۵ء

مستقل پتا : بہاولنگر : رحمٰن اسٹریٹ نمبر ۱، بہاولنگر۔

لاہور : پوسٹ بکس نمبر ۹۹۰، لاہور۔۲

---

[1] اشاریۂ غالب پر ۱۹۷۴ء میں ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا دوسرا انعام مبلغ ۳ ہزار روپے عطا کیا۔

[2] مطالعۂ یلدرم پر ۱۹۷۴ء میں ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا پہلا انعام مبلغ ۵ ہزار روپے عطا کیا

[3] اس مقالے (صفحات ۸۸۷) پر ۱۹۷۲ء میں جامعہ سندھ نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند عطا کی۔

[4] غالب اور انقلاب ستاون پر ۱۹۷۴ء کا داؤد ادبی انعام مبلغ ۵ ہزار روپے عطا کیا گیا۔

دیباچہ

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے جو کام کیا، اُس کا نام کبھی تحریک تھا، لیکن اَب یہ تحریک، تاریخ بن چکی ہے اور اس لیے اُن کی رُودادِ حیات پیش کرنے کا عمل، میرے نزدیک ایک تاریخی عمل ہے۔ مولوی عبدالحق کے نام اور کام سے واقف ہونا، اپنی تہذیب، روایت اور تاریخ سے واقف ہونا ہے۔ تاریخ، روایت اور تہذیب کی اِسی واقفیت کو عام کرنے کے لیے یہ رُودادِ حیات مُرتّب کی گئی ہے کہ میرے نزدیک اَیسا کرنا ایک قومی فریضے کی بجا آوری تھی۔

بابائے اُردو کے احوالِ زندگی اور ان کی سیرت و شخصیت کے مُطالعے پر مبنی، اِس کتاب کے دو حصّے ہیں: پہلا حصّہ "حیاتِ عبدالحق" کے اجمالی خاکے پر مُشتمل ہے۔ اِس کا بیشتر حصّہ مولوی عبدالحق کی اپنی زبان میں ہے۔ اِس کی ترتیب و تدوین میں مولوی صاحب کی کم و بیش سب تحریروں کو نظر میں رکھا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے نوّے برس کے لگ بھگ عمر پائی (ولادت: اگست ۱۸۷۰ء، وصال: اگست ۱۹۶۱ء)۔ نوّے برس کی داستانِ حیات قریب نوّے صفحات ہی میں بیان ہُوئی ہے۔ اِس داستان کو بہت بڑھایا تو جا سکتا تھا،

لیکن اس سے زیادہ اختصار میرے لیے ممکن نہ تھا۔

انجمن ترقّی اُردو سے مولوی عبدالحق کا قدیمی اور قلبی تعلق تھا۔ انجمن اور مولوی عبدالحق میں کوئی دُوئی نہیں رہ گئی تھی۔ کم از کم میرا ذہن "انجمن" کے ایسے تصوّر سے عاجز ہے جس کے گوشے گوشے میں عبدالحق کے دل کی دھڑکن نہ سُنائی دیتی ہو۔ میرے لیے اُس "عبدالحق" کا تصوّر بھی محال ہے، جس کے سن و سال کا کوئی لمحہ "انجمن" کے ذکر، فکر اور عمل سے خالی ہو۔ اِس طرح "حیاتِ عبدالحق" کی یہ رُوداد جس طرح "عبدالحق" کی کہانی ہے اُسی طرح "انجمن" کی کہانی اور کارگزاری بھی ہے۔

کتاب کا دُوسرا حصّہ: "ذکرِ عبدالحق" ـــ "چند ہم عصر" کے آئینے میں مولوی عبدالحق کی سیرت و شخصیت کو پیش کرتا ہے۔ یہ حصّہ مولوی عبدالحق کے حال و قال کا نفسیاتی مُطالعہ ہے۔ اِس حصّے کی ساری عبارتیں مولوی عبدالحق کی تحریر میں ہیں اور "چند ہم عصر" سے ماخوذ ہیں۔ انہیں مصنف کے مُطالعۂ ذات کے نقطۂ نظر سے ایک نئی ترتیب دینے کی خدمت البتہ میں نے انجام دی ہے۔ ترتیبِ نو اور تشکیلِ جدید کا یہ عملِ تحلیل، کچھ تفصیل چاہتا ہے:

"چند ہم عصر"، تیئس ۲۳ شخصی خاکوں یا سیرتوں پر مُشتمل، مولوی عبدالحق کا معروف نثری مجموعہ ہے، جسے اُردو میں مُرقع نگاری کی آبرو کہنا بجا ہے۔ یہ سیرتیں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۹ء تک کوئی ساٹھ برس کی طویل مدّت میں مختلف مواقع پر لکھی گئیں۔ اِن ساٹھ برسوں میں اُردو کے رشتے سے مولوی عبدالحق کا ہزارہا افراد سے راست اور قریبی تعلق رہا۔ "ہم عصروں" کی کثرت اور طویل زمانی وسعت کے باوصف محض اِن "چند" افراد ہی کی سیرت پر قلم اُٹھانا، یقیناً بے سبب نہیں۔ یہ سخت انتخاب، خود مولوی عبدالحق کی اپنی سیرت کے مطالعے کے لیے وافر اندرونی شہادتیں اور بُنیادیں فراہم کرتا ہے، اور اس کی بدولت مولوی عبدالحق کے اُفتادِ مزاج

کی نفسیاتی تحلیل کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے خاکے محض سر کا بوجھ اُتارنے کے لیے نہیں لکھے گئے اور نہ کسی اضطراری جذبے کے تحت معرضِ تحریر میں آئے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مولوی عبدالحق زندگی کے طویل سفر میں ان افراد سے کسی نہ کسی مخصوص وجہ سے متاثر ہوئے اور اس ربطِ نہانی نے اُن سے یہ خاکے لکھوائے۔ متاثر محض اِن معنوں ہی میں نہیں کہ اِن شخصیتوں کو اُنہوں نے اپنے تئیں آدمیت و انسانیت کی مکمل اِکائی اور عظمت و بزرگی اور بڑائی کا معیار جانا اور ممکن ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی حیثیت سے ان کی پیروی بھی کی ہو۔ لیکن اس سے ہٹ کر، سیرت کشی کے لیے افراد کے اس انتخاب اور چناؤ میں بڑی حد تک ان افراد سے خود مولوی عبدالحق کی اپنی ذہنی ہم آہنگی، طبعی و مزاجی مناسبت و موانست، اور گزرانِ حیات کے اصولوں اور ضابطوں میں یک گونہ اشتراک کو دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے نگارخانے میں قدم قدم پر ہمیں مولوی عبدالحق کی سیرت و شخصیت کی جھلکیاں اور پرچھائیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنے چند ہم عصروں اور ہم نشینوں کی سیرت و کردار کے جو خاکے اور نقشے تیار کیے ہیں، اُن میں جاننے والوں کے لیے خود مولوی عبدالحق کے اپنے "رنگِ طبیعت" کا مشاہدہ کرنا زیادہ مشکل نہیں:

"مصنف، یوں تو اپنی ہر تحریر کے اسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک دکھانے پر مجبور ہے لیکن خاص کر اُس وقت جب، وہ دوسروں کی سیرت پر قلم اُٹھاتا ہے اُس کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اُٹھ جاتا ہے اوروں کے جوہر پرکھنے میں خود اُس کے جوہر کھل جاتے ہیں۔"

(ڈاکٹر سید عابد حسین، رسالہ جوہر، دہلی ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۱۸)

"چند ہم عصر" فن کا وہ آئینہ خانہ ہے جس کے عرض میں مولوی عبدالحق کی شخصیت کا جوہر تڑپتا نظر آتا ہے۔ یہ وُہ مقام ہے، جہاں اُن کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب بار بار اُٹھا ہے اور بار ہا سیرت کے بندِ قبا کُھل کُھل گئے ہیں۔ اِس طرح ہم عصروں کے اِس انتخاب کے سہارے، ہم خود مولوی عبدالحق کی سیرت تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اور یہ "چند ہم عصر" کا بہت ہی کار آمد اور نادر پہلو ہے۔ شخصیتوں کی آڑ میں مولوی عبدالحق کا شوقِ بے اختیار دیدنی ہوتا ہے اور اُن پر عشق پیشہ تیر کے ایسے آفتِ زماں کا گمان ہونے لگتا ہے، جو اپنے سارے مطلب پردے میں ادا کرتے ہے۔

"ذکرِ عبدالحق" کا مطالعہ کیجئے اور دیکھیے کہ دربیانِ حکایتِ دیگراں، مولوی عبدالحق نے اپنی ذات وصفات سے کس طرح بے اختیارانہ حجاب اُٹھائے ہیں۔ یہ تمام کا تمام حصّۂ کتاب، مولوی عبدالحق کی زبان وبیان میں ہے جسے مَیں نے "چند ہم عصر" کے شخصی مضامین سے اخذ وانتخاب کر کے، ترتیب وتشکیل دیا ہے۔ اصل عبارت کے حوالے صفحہ وار ذیلی حاشیے میں دے دیے گئے ہیں۔ یہ سب حوالے "چند ہم عصر" کے چھٹے اور مولوی عبدالحق کی زندگی کے آخری ترمیم شدہ ایڈیشن، مطبوعہ: اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء سے ہیں۔

ربط اور تسلسل قایم رکھنے کے لیے مجھے ضمیروں اور صیغوں میں جہاں تہاں خفیف ردوبدل کرنا پڑا ہے، لیکن اسے جہاں تک مُمکن ہوسکا، قوسین کے ذریعے نمایاں کر دیا گیا ہے تاکہ تشابہ اور التباس کا امکان باقی نہ رہے۔ اس کے علاوہ واقعیت کے اتمام کے لیے، ایک فنی رعایت کے ساتھ، کُچھ تعزیتی پیغامات اور تاریخی قطعات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اِس ضمن میں ابوالاثر حفیظ جالندھری، پروفیسر حامد حسن قادری (مرحوم) اور حضرت رئیس امروہوی کا ممنون ہوں کہ ان بزرگوں نے مجھے اُپنے رشحاتِ نظم ونثر سے نوازا اور رعایتِ خاص کی تکمیل میں میرے مُشکل کُشا بنے۔

اس موقع پر بابائے اُردو کے دیرینہ رفیقِ خاص اور اپنے کرم فرما جناب حکیم اسرار احمد کریوی کا دلی شکریہ ادا کرنا میرا خوشگوار فرض ہے، جنکی رہنمائی مجھے برابر حاصل رہی۔ یہ ذکر ایک "اعترافِ مزید" کے بغیر نامکمل رہے گا۔ "نقش کے اندر سے نقاش کو ڈھونڈ نکالنے" کی یہ راہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب کی سُجھائی ہوئی ہے، جنھوں نے پینتیس برس پہلے (رسالہ جوہر، عبدالحق نمبر، انجمن اتحادِ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۱۵) مولوی عبدالحق کی سترّویں سالگرہ کے موقع پر "چند ہم عصر" کے رنگا رنگ مُرقع میں مُصنّف کا رنگِ طبیعت تلاش کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں اپنی اس کاوش "ذکرِ عبدالحق" کو ایک خاص اہمیت دیتا ہوں اور اسی لیے مجموعی طور پر کتاب بھی اسی نام سے موسوم کی گئی ہے۔ "اس اندازِ کار" کو مقبول ہونا چاہیے اور اس طرزِ واداسے شخصیات کے مُطالعے کی راہ عام ہونی چاہیے

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اس کام کی تکمیل کے دوران میں اب سے تیرہ برس پہلے "داستانِ زبانِ اُردو" کے نامور مُصنّف مولانا حامد حسن قادری نے، کہ اب اُن کا ذکر بھی ہمارے لیے داستان بن گیا ہے، میری گزارش پر بابائے اُردو کی عیسوی اور ہجری تواریخِ وفات موزوں کی تھیں۔ اُن کے قلمی قطعاتِ تاریخ کا عکس، اب کتاب کی زینت ہے۔ بابائے اُردو کے ایک مُعتمد رفیقِ کار مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی نے مولوی عبدالحق کی وفات پر ایک مادۂ تاریخ نکالا تھا، جناب رئیس امروہوی نے اسے میری فرمائش پر نظم کیا۔ اب، کہ مولانا سیّد ہاشمی فرید آبادی، ہمارے درمیان موجود نہیں، یہ قطعۂ تاریخ آغازِ کتاب میں درج کیا جارہا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے "ذکرِ عبدالحق" کی پہلی اشاعت (رسالہ نقوش مئی ۱۹۶۵ء) پر اپنے ایک گرامی نامے میں مجھے داد سے سرفراز فرمایا تھا، یہ "حرفِ معتبر" بطورِ پیش لفظ، کتاب کی توقیر بڑھا رہا ہے۔

کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ، بابائے اُردو کی ایک نادر غیر مطبوعہ قلمی تحریر مع عکس پیش کی جا رہی ہے۔ یہ مولانا شبلی کے "موازنۂ انیس و دبیر" (۱۹۰۶ء) پر مولوی عبدالحق کا ایک ریڈیائی تبصرہ ہے اور راقم الحروف کی توضیحات کے ساتھ پہلی بار چھپ رہا ہے۔

بابائے اُردو، دبستانِ سرسید کی آخری کڑی اور اسلاف کی ایک قیمتی نشانی تھے۔ اپنے ارث سے بے خبر رہنا یا کماحقہ، واقفیت نہ رکھنا، فخر کی بات نہیں۔ اسلاف کے ورثے کو قایم رکھنا اور ترقی دینا اور اُن کے کارناموں کا وقوف رکھنا، ہمارا فرض ہے۔ "ذکرِ عبدالحق" اسی احساسِ فرض کا ادنیٰ حاصل ہے۔ مولوی عبدالحق نے میر تقی میر کی خود نوشت سوانح "ذکرِ میر" کو گوشۂ گمنامی سے نکالا اور اُجالا۔ "ذکرِ عبدالحق" بابائے اُردو نے اپنے حالات میں خود نہیں لکھی لیکن "ذکرِ میر" کی طرح یہ خود نوشت کے آثار و انداز سے یکسر خالی نہیں۔ اُمید ہے کہ اس مخلصانہ کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

زہرا معین کی ذات میں مجھے اچھائی، سچائی اور سُندرتا کی معرفت نصیب ہوئی:

اچھائی اور سچائی اور سُندرتا ہیں ایک
جو سچا ہے وہ سُندر ہے، جو سُندر وہ نیک

میرے لکھنے پڑھنے کا کوئی کام اور منصوبہ زہرا کی داد اور امداد کے بغیر پورا نہیں ہوتا، یہ وہ مقام ہے، جہاں اظہارِ تشکر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ––– اور اس سلسلے کی آخری بات یہ کہ: سنگِ میل پبلی کیشنز کے برادرم نیاز احمد صاحب بڑی خوشی اور خوش دلی سے یہ کتاب چھاپ رہے ہیں: کس مُنہ سے شکر کیجیے اِس لُطفِ خاص کا!

لاہور
یکم مئی ۱۹۷۵ء

معین الحق

حرفِ معتبر:

مولانا عبدُالماجد دریابادی

برادرم مُعین الرحمٰن صاحب، وعلیکم السّلام،

بڑی ہی حیرت یہ ہے کہ "ذکرِ عَبدُالحق" پر "صدق" میں اظہارِ خیال رہ کیسے گیا، ایسا کبھی ہوتا نہیں، خُدا معلُوم کیا بجوگ پڑ گیا ——— اور حیرت سے بڑھ کر ندامت اور ندامت سے بھی بڑھ کر مُعذرت واجب آگئی۔

"نقوش" کے آخری نمبر (شُمارہ ۱۰۲، مئی ۱۹۶۵ء) میں "ذکرِ عَبدُالحق" پڑھا۔ میں ہوتا تو عُنوان رکھتا "عَبدُالحق بہ زبانِ عَبدُالحق"۔ یہ خلّاقی تو اللہ میاں کی سُنی تھی کہ حشر میں جسم کے ایک ایک ٹکڑے پُرزے کو جوڑ کر جسم کو پھر سے پیدا کر دیں گے اور نیست کو ہست بنا دیں گے۔ بندے کے لیے یہ صَنّاعی بھی کچھ کم نہیں کہ اُس نے اپنی چابکدستی سے صیغۂ غائب کو صیغۂ مُتکلّم میں تبدیل و تحویل کر دیا! ——— مُشتِ خاک ہے آخر کچُھ تو حق اَحسنُ الخالقین کی نیابت کا ادا ہی کر پایا۔ نہ ہُوا مُشاعرہ، ہر طرف سے صدائیں مَرحبا و سبحان اللہ کی آنے لگیں!

بہر حال مَیں تو قائل، آپ کی دیدہ ریزی، ذہانت، ذوقِ صحیح، غرض ایک لفظ میں آپ کی "صنعت گری" کا ہو ہی گیا ———

والسّلام

عبدُالماجد

دریاباد، ضلع بارہ بنکی، انڈیا۔

I, D, 2/2

حامد حسن قادری
~~ناظم آباد بلاک~~
~~بلاک~~ کراچی-۱۸

مکرمی جناب معین الرحمن صاحب

السلام علیکم

بھیجئے، آپ کی فرمائش جلد ہی پوری ہو گئی

امید کہ اچھے ہوں گے

والسلام

احقر حامد حسن قادری ۱۹- مارچ ۱۹۶۲ء

تواریخ وفات

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم

(۱)

جدا ہم سے بابائے اردو ہوئے — ہم اب فیض سے ان کے محروم ہیں
انہوں نے جو اردو کی کیں خدمتیں — وہ سب قوم کے دل پہ مرقوم ہیں
بہت ان کے احسان آئیں گے یاد — کہ اب محسن ان کے سے معدوم ہیں
یہ اللہ کے فضل سے ہے امید — کہ باغ جناں میں وہ مرحوم ہیں
لکھی قادری نے یہ سال وفات
کہ "تھے خادم قوم، مخدوم ہیں"
۱۹۶۱ء

(۲)

مولوی عبدالحق احسان شعار — جن سے پاک و ہند میں روز فیض یاب
برگزیدہ محسن علم و ادب — یعنی گرو بابائے اردو جن کا خطاب
خدمت اردو میں دی جان عزیز — ایسی ہستی ہے جہاں میں انتخاب
نام عشق و زباں میں کر گئے — بے نظیر و بے مثال و لاجواب
قادری، انکا ہے تاریخ وفات — "خادم قوم و زباں عزت مآب"
۱۳۸۱

سالِ تاریخ حادثۂ وفات

(بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم)

○

رحلتِ مولوئ محترم عبدالحق
مرگِ تازہ پئے توسیع زبانِ اردو
زندہ شد، شیوۂ اسلاف گرامی ازوَے
بُود و اَست از صفِ سرسیّد و حالی ہم لُو
ہاشمی، فکر چو فرمود پئے سال رئیس
ہاتفِ غیب صدا زد "غفر اللہ لہ"

۱۳۸۱ھ

مستخرجہ: ہاشمی فریدآبادی
نظم کردہ: رئیس امروہوی

Dr. Sir Mohammad Iqbal,
M. A., Ph D.,
Bar at-Law

Mayo Road.
LAHORE......۲۷ دسمبر ۳۷ء......193

مخدومی جناب مولانا - تسلیم شریف

السلام علیکم - الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری آپ کو
مبارک ہو - حقیقت یہ ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی نے آپ کی قدر شناسی
کرکے اپنے علم کی ثقاہت یہ مستحق مبارکباد کر لیا - اس کے علاوہ آپ
مبارکباد دیتے ہیں یہ الہ آباد یونیورسٹی کو بھی اس کی قدر شناسی پر مبارکباد
دنیا میں - امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا -

مخلص

محمد اقبال

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام علامہ اقبال کے خط کا عکس

اس خط پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز حسن نے
بالکل ٹھیک کہا ہے کہ :

"اس میں شک نہیں کہ الہ آباد یونیورسٹی نے مولوی صاحب کو
ڈی لٹ اور علی گڑھ نے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگریاں دے
کر خود اپنی ہی عزت کی —" (اقبال اور عبدالحق، ص ۶۸)

— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

حیاتِ عبدالحق

(سوانحی خاکہ)

۱۔ مولد، تاریخ ولادت، نسب، خاندانی حالات: ۱۸۷۰ء

۲۔ طالب علمی کا زمانہ — علی گڑھ میں ورود: ۱۸۸۸ء

۳۔ انجمن ترقیِ اُردو سے تعلق: ۱۹۱۲ء

۴۔ بحیثیت "معتمدِ انجمن" دکن میں: ۱۹۱۲-۱۹۳۶ء

۵۔ اُردو کی اشاعت و مدافعت میں جہاد: ۱۹۳۷-۱۹۴۷ء

۶۔ مولوی عبدالحق اور انجمن کی ہجرت: ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء

۷۔ پاکستان میں ابتدائی بے سروسامانی: ۱۹۴۹-۱۹۵۴ء

۸۔ مردم گزیدہ مولوی عبدالحق: ۱۹۵۵-۱۹۵۸ء

۹۔ مولوی عبدالحق: اِنقلاب ۱۹۵۸ء تا انتقال ۱۹۶۱ء

۱۰۔ اِشاریۂ تصانیفِ عبدالحق: ۱۹۰۱-۱۹۶۱ء

"انجمن ترقی اردو سے مولوی عبدالحق کا قدیمی اور قلبی تعلق تھا۔ انجمن اور مولوی عبدالحق میں کوئی دوئی نہیں رہ گئی تھی۔ کم از کم میرا ذہن "انجمن" کے ایسے تصور سے عاجز ہے جس کے گوشے گوشے میں عبدالحق کے دل کی دھڑکن نہ سنائی دیتی ہو۔ میرے لیے اس "عبدالحق" کا تصور بھی محال ہے جس کے سن و سال کا کوئی لمحہ "انجمن" کے ذکر، فکر اور عمل سے خالی ہو۔ اس طرح "حیاتِ عبدالحق" کی یہ روداد جس طرح "عبدالحق" کی کہانی ہے، اسی طرح "انجمن" کی کہانی اور کارگزاری بھی ہے۔"

—— ڈاکٹر سید معین الرحمن

۱

مولد، تاریخِ ولادت، نسب، خاندان

۱۸۷۰ء

FORM OF APPLICATION FOR AN ARMS LICENSE.

Name of applicant. Abdul Haq

Father's Name. Ali Hasan

Home Address. Hapur

Present Address. 1, Daryaganj, Delhi

Date of birth and age. 20th Aug 1870

Nature of employment and pay. Retired Education Service, Hyderabad Dn

Income Tax ~~and/or Land Revenue~~ (Score out what does not apply) paid during the Last Year.

Kind of weapon required.

9. Purpose for which required. Self protection & Shikar

Has applicant an arms license at present? If so, give details.

Was applicant ever refused a license? If so, give details.

Has any license ever been cancelled? If so, give details.

If applicant has never had a license, how has need now arisen.

Any claims for special consideration.

I declare that the above particulars are true.

Signature. Abdul Haq

Date 6th May. 1947

...Pr Delh-3000-8-47.

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ :

"۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات میں جن وحشیانہ حرکات اور بربریت کا ظہور ہوا، انہیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بے چارہ خواہ مخواہ بدنام ہے۔ وہ انسان کی قساوتِ قلبی، ظلم و جبر، غارت گری و خوں ریزی کو نہیں پہنچتا ـــــ" (خطبات ص ۵۱۴)

ان "ہولناک فسادات" سے کوئی تین مہینے پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دہلی میں ۶۔مئی ۱۹۴۷ء کو "ذاتی حفاظت اور شکار" کے عنوان سے اسلحے کے حصول کے لیے ایک مقررہ فارم پر درخواست دی تھی۔ اس فارم کی خانہ پری بابائے اردو کے اپنے قلم سے ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی تاریخِ ولادت ۲۰۔ اگست ۱۸۷۰ء بتائی ہے۔

ـــ سید معین الرحمٰن

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے سوانح خصوصاً اُن کے نسب، مولد، ماٰئہ تعلیم اور اُن کی زندگی کے ابتدائی حالات کے ضمن میں سب سے زیادہ معتبر اور معلومات آفریں تحریر بابائے اُردو کے حقیقی برادر خورد شیخ احمد حسن کی ہے۔ وُہ لکھتے ہیں کہ:

میرے دو بڑے بھائی تھے۔ ایک حقّی بھائی (شیخ ضیاء الحق مرحوم جو بلسٹے[1]) دوسرے ابدی بھائی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ غلط تلّفظ ایک دن حقیقت ہو کر رہے گا اور بھائی عبدالحق صاحب اپنے عشق کی بدولت جو اُنہیں اُردو سے تھا واقعی ابدی شہرت کے مالک ہو کر رہیں گے۔

ہمارے خاندان میں نام حسن یا حُسین پر رکھے جاتے ہیں لیکن جیسا کہ مَیں نے اپنے گھر میں سُنا تھا والد صاحب شیخ علی حسن صاحب مرحوم کے

---

[1] شیخ ضیاء الحق کے حالات کے لیے دیکھیے مضمون: "بابائے اُردو کے بڑے بھائی"
از: سراج احمد عثمانی چشتی، مطبوعہ "قومی زبان" کراچی، بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۸۰-۱۸۸

پیرو مرشد نے اُن سے فرمایا کہ اپنے لڑکوں کا نام "حق" پر رکھنا۔ لہٰذا پہلی دو نرینہ اولادوں کا نام حق پر رکھا گیا۔ اب اسے محض حُسنِ اتفاق کہیئے یا پیر صاحب موصوف کی کرامات کہ ہمارے خاندانی ناموں میں لفظ "حق" کا شامل ہونا بڑا ہی مبارک ثابت ہوا۔

میرے دونوں بڑے بھائیوں کی پیدائش ہاپوڑ کی ہے اور جیسا کہ اکثر لکھا گیا ہے کہ بھائی عبدالحق صاحب مرحوم سراوہ جو ہاپوڑ سے ملحق واقع ہے، میں پیدا ہوئے صحیح نہیں۔ یہ بات ہمارے خاندانی رسم و رواج کے خلاف تھی کہ زچگی کا انتظام میکے میں ہو۔ اس غلط فہمی کی وجہ شاید یہ ہو کہ والدہ مرحومہ اپنے ماں باپ کی واحد لڑکی اور اپنے بھائیوں کی ایک ہی بہن تھیں۔ ہمارے نانا اور ماموں اُن کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے اور اُن کا قیام اکثر سراوہ میں رہتا تھا لیکن جہاں تک بھائی صاحب کی پیدائش کا تعلق ہے اُن کا مولد ہاپوڑ ہی ہے[1]۔

ہم لوگ زمانۂ قدیم سے ہاپوڑ کے ہی رہنے والے ہیں۔ ہمارے آباء و اجداد ہندو تھے اور کائستھ برادری سے تعلق رکھتے تھے جن کے سپرد سلطنتِ مغلیہ میں ہمیشہ محکمۂ مال کی اہم خدمات رہیں۔ ہم لوگ عہد شاہ جہانی میں مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن خدماتِ مذکورہ نیز حکومت کی عطا کردہ معافیاں بدستور قائم رہیں اور یہ معافیاں انگریزی حکومت نے بھی بحال رکھیں۔ میں ہی خاندان کا وہ آخری فرد ہوں جس نے بہ منظوری گورنمنٹ

---

[1] تاریخِ ولادت: ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء

۱۹۴۵ء میں اپنی خاندانی معافی کو ختم کیا۔

والدہ مرحومہ اکثر عبدی بھائی کا تذکرہ بڑی خوشی اور فخر سے کرتی تھیں۔ وہ فرمایا کرتی تھیں کہ "بچپن سے ہی اس کی عادتیں ایسی تھیں کہ نہ تو لڑتا جھگڑتا تھا اور نہ کھیل کود میں شریک ہوتا تھا۔ زیادہ تر میرے ساتھ رہتا تھا میں نماز پڑھتی تھی تو میرے پاس چوکی پر کھڑا ہو کر نماز کی نقل کیا کرتا تھا۔ اس کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور ابتدائی تعلیم کے زمانے میں بھی سب سے الگ بیٹھ کر اپنا زیادہ وقت پڑھنے میں گزارتا تھا۔

والدہ صاحبہ خود بے حد عبادت گزار تھیں اور پابندِ صوم وصلوٰۃ تھیں۔ ظاہری حالت کچھ بھی ہو لیکن بھائی عبدالحق صاحب مرحوم کے دل میں خدا اور مذہب کا بے حد احترام تھا۔۔۔۔۔۔

پنجاب پر برطانیہ کا تسلّط ہونے کے بعد بہ سلسلۂ ملازمت یو۔ پی محکمہ مال کے بہت سے تجربہ کار ملازمان کو طلب کیا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ضلع میرٹھ سے ہمارے تین ماموں نامزد ہوئے۔ جن میں سے شیخ امتیاز علی صاحب کمشنر کے پیشکار مقرر ہوئے۔ نیاز علی صاحب کا تقرر تحصیل داری پر ہوا اور تیسرے بھائی امراؤ علی صاحب محکمہ پرمٹ (نمک) میں متعین کیے گئے اور ان تین بھائیوں نے اپنے چھوٹے بھائی محمد صدیق صاحب کو بھی پنجاب بلا لیا۔ یہ سب بھائی اضلاع فیروزپور گجرات و دیگر ملحقہ علاقوں میں تعینات رہے انہوں نے اپنی بہن (ہماری والدہ) کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور پھر والد صاحب بھی پنجاب چلے گئے۔ جہاں

بڑے ماموں یعنی امتیاز علی صاحب کے توسط سے اُن کا تقرر انسپکٹری مال پر ہو گیا۔

بھائی عبدُالحق صاحب کی تعلیم میٹرک تک پنجاب میں ہوئی اور حالی کی صد سالہ جوبلی کے موقعہ پر مُسدّس کا جو ایڈیشن شائع ہوا تھا اُس پر مقدمہ لکھتے ہوئے بھائی صاحب نے بسلسلۂ تقریب ختنہ، طوائف کے مُسدّسِ حالی گانے کا جو واقعہ بیان کیا ہے[۱] یہ اُسی زمانے کا ہے جب ہمارا خاندان عرصۂ دراز تک پنجاب میں مقیم رہا۔ یہ تقریب ہمارے ماموں زاد بھائیوں کی تھی جو موضع صدر الدین والا فیروز پور میں کی گئی تھی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد والد صاحب ہاپوڑ میں واپس آ گئے اور بھائی صاحب مرحوم کو علی گڑھ کالج میں داخل کر دیا گیا۔"

(رسالہ: اُردو، بابائے اُردو نمبر، مرتبہ: سید وقار عظیم، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۱-۲۳)

اسکول اور کالج کے زمانے کی رُوداد سب کی سب خُود مولوی عبدُالحق کی زبانی سُنیے۔ اسے میں نے اُن کی مختلف تحریروں سے مرتب کیا ہے:

---

[۱] رجوع کیجیے: مقدماتِ عبدُالحق، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۵۸

۲

طالب علمی کا زمانہ — علی گڑھ میں ورود

۱۸۸۸ء

۶

"میں نے جب ہوش سنبھالا تو مسلمانوں میں کچھ ہل چل نظر آئی ۔ مسلمان شرفا خصوصاً بڑے بوڑھے اپنے دیوان خانوں میں بیٹھتے تو کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کالج یا سید احمد خاں کا ذکر نکل آتا ۔ سید احمد خاں اُس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوعِ بحث تھے ۔ اُن کی نسبت کُفر و الحاد کا فتویٰ تو عام تھا ۔ مولوی صاحبان اِس ذکرِ عزیز کو اپنے وعظوں، بحثوں، تحریروں اور تقریروں میں طرح طرح سے مزے لے لے کر بیان کرتے اور تخیّل کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے ۔ سُننے والے اور معتقدین ان باتوں پر اپنی طرف سے خوب خوب حاشیے چڑھاتے، کوئی کہتا گردن مروڑی مُرغی کھاتا ہے اور حلال حرام میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ کوئی کہتا اس نے اپنا سر بیچ دیا ہے، مرنے کے بعد انگریز اس کا سر لے جائیں گے ۔ ... یہ سب کچھ تھا لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ اُن کی دانش مندی کے سب قائل تھے، سَر بِکنے کا قصّہ اِسی بنا پر مشہور ہُوا ۔

میں یہ واہی تباہی سُنتا رہتا تھا ۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اتفاق سے ایک روز میرے ایک ہم جماعت مجھے اپنے گھر لے گئے وہاں مَیں نے "تہذیب الاخلاق" کے پرچے دیکھے اور پڑھنے شروع کیے ۔ اس میں ایسا دل لگا کہ اس کے بعد میں اُن سے پرچے مانگ لاتا اور پڑھتا رہتا ۔ اَب میری آنکھیں کھلیں کہ اصل معاملہ کیا ہے "تہذیب الاخلاق" کا مطالعہ مجھے کھینچ کر علی گڑھ لے گیا اور مَیں کالج کے اسکول میں داخل ہو گیا ۔ پہلے کانوں پہ تکیہ تھا

لے رسالہ نورس (کراچی) جولائی ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۲

اَب آنکھوں نے جلوہ دکھایا لیکن دُور سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے میں فرق ہے۔ جب میں کالج میں پہنچا تو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آخری ۲ دو سال میں زیادہ قُربت نصیب ہُوئی اور سیّد علیہ الرحمہ کو کام کرتے، ہم کلام ہوتے، اُٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے، بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کی پیمائش کرتے، مسجد میں نماز پڑھتے، جلسوں میں تقریر کرتے اور گرجتے دیکھا، اُن کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

مَیں جب اَوّل روز مدرستہ العلوم مُسلمانان ایم او کالج علی گڑھ کے اسکول میں داخل ہُوا اور بورڈنگ ہاؤس میں پرنسپل صاحب کی عنایت سے کمرہ مل گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ نئی دُنیا میں آگیا ہُوں۔ وہاں کے طالب علم، اُن کی عادات اور شرارتیں اور مصروفیات، وہاں کے اُساتذہ، وہاں کا ڈائننگ ہال اور اُس کے کھانے۔ دُنیا بدل گئی پر اُن کا مزہ کبھی نہ بدلا۔ مسجد اور نمازیں اور مؤذن کی کڑک دار آواز، یہ سارا ماحول میرے لیے بالکل نیا اور عجیب سا تھا۔ سنہ ۱۸۸۸ء یا سنہ ۱۸۸۹ء کی بات ہے، اُس وقت طالب علموں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی۔ طالب علم ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر علاقے کے تھے۔ بعض اوقات ہندوستان کے باہر کے بھی آکر داخل ہو جاتے تھے اور کوئی صوبائی امتیاز باقی نہ رہتا۔ سب اُردو بولتے تھے اور بے تکلّف بولتے تھے۔ میرے ایک ہم جماعت بنگالی چاٹگام کے، اِس قدر صاف اور بے تکلّف اُردو بولتے تھے اور اُن کا لہجہ بھی ایسا تھا کہ میں ابتدا میں یہی سمجھتا رہا کہ یوپی کے کسی مقام کے رہنے والے ہیں۔ ایک خاص بات جو مجھے یہاں نظر آئی وُہ قومیت کی مہک تھی جو کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ کالج کے بانی سر سیّد احمد خان کا طُفیل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا اور اِس احساس کو تقویت

لے قومی زبان، کراچی، ۱۶ اگست سنہ ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵

اُن اکابر قوم سے پہنچتی تھی جو کسی نہ کسی تقریب سے کالج میں یا سیّد صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔

انٹرنیس (جسے آج کل میٹریکولیشن کہتے ہیں) کے امتحان میں کامیابی کے بعد مَیں کالج کی جماعتوں میں چلا گیا۔ اسکول میں سب معلّم ہندوستانی تھے سوا ہیڈ ماسٹر ہورسٹ کے جو بلند قامت گراں ڈیل شخص تھے اور کسی فوج کے کرنیل معلوم ہوتے تھے۔ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ولایت حسین تھے جو بڑے محنتی اور فرض شناس تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی اُنہیں کے ذمّے تھی اور وُہ بورڈنگ ہاؤس ہی کے کمرے میں رہتے تھے۔ اُن کے ذمّے اور بھی کئی کام تھے۔ سر سیّد، محسن الملک اور دیگر اکابر اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ میرے حال پر بڑی مہربانی فرماتے۔ وُہ ہماری جماعت کو ریاضی بھی پڑھاتے تھے۔ ایک دن مَیں کسی وجہ سے اُن کا کام کر کے نہ لایا، وُہ بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے: "مَیں تو تمہارا بھاٹ بنا ہُوا ہوں اور جگہ جگہ تعریف کرتا پھرتا ہوں اور تم ہی میرا کام کر کے نہیں لاتے۔" مجھے بہت شرم معلوم ہوئی اور اُس کے بعد سے مَیں نے اپنے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

مَیں کبھی کسی کھیل میں شریک نہ ہُوا۔ مسٹر بیک کئی بار مجھے اپنے کمرے سے پکڑ کر کھیل کے میدان میں لے گئے۔ مَیں ساتھ ہو لیتا۔ فیلڈ میں پہنچ کر غچّہ دے کر دُوسری طرف نکل جاتا۔ یونین کے الیکشن میں بڑا ہنگامہ ہوتا۔ مَیں یونین کے جلسوں اور تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا۔[1]

مَیں کالج میں ایک مِٹھا طالب علم تھا۔ مَیں نہ کبھی کھیلوں میں شریک ہُوا، نہ یونین میں حصّہ لیا اور نہ انتخاب پریزیڈنٹ و سیکرٹری کے ہنگامے میں شامل ہوا۔ کالج میں کئی انجمنیں تھیں... مَیں نے اُن میں شرکت نہ کی، البتہ "اخوانُ الصفا" میں جس کے بانی پروفیسر آرنلڈ تھے، دو ایک مضمون پڑھے۔ ایک مضمون[2]

---

[1] قومی زبان، کراچی۔ ۱۶ اگست ۱۹۶۰ء صفحہ ۶

[2] انجمن ترقیٔ اُردو کی کہانی، مولوی غلام ربّانی، ۱۹۳۹ء، ص ۱۷

میں نے سینٹ پال پڑھا ۔ اُس دن سے لڑکے مجھے سینٹ پال کہنے لگے ۔ مُطالعے شوق مجھے ابتدا سے تھا ۔ تعطیلوں میں طالب علم اپنے اپنے وطن چلے جاتے تھے چھٹیوں کے دنوں میں پڑھنے کے لیے کچھ طالب علم لائبریری سے کچھ کتابیں مستعار لے جاتے تھے یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا ۔ میں بہت سی کتابیں مختلف نوعیت کی انتخاب کرتا تو آرنلڈ صاحب کہتے: "تمھیں بڑی ہوس ہے ۔ اتنی ساری کتابیں کیسے پڑھو گے ۔" وہ ٹھیک کہتے تھے ۔ سب کتابیں کہاں پڑھ سکتا تھا ۔ بعض ویسی کی ویسی ہی واپس لے آتا ۔

کالج میں تمام پروفیسر سوا عربی، فارسی، سنسکرت اور ریاضی کے انگریز تھے ۔ فارسی، عربی کے پروفیسر مولانا شبلی اور مولانا عباس حسین تھے ۔ ریاضی کے بابو مکرجی ۔ مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مورّخ تھے ۔ اُن کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہوتا تھا ۔ وہ موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اِس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا ۔ عباس حسین نرے مُلّا تھے، ادبی ذوق سے عاری ۔ البتہ ضلع جگت کے اُستاد تھے ۔ ضلع بولنے سے کبھی نہ چوکتے اور جو کوئی اُن کے جواب میں ویسا ہی بول جاتا تو باغ باغ ہو جاتے ۔ ایک بار کالج کی تنخواہوں میں بہت دیر ہو گئی ۔ مولوی شبلی سے بہت شکایت کرنے لگے کہ تنخواہ نہ ملنے سے بہت تکلیف ہے ۔ مولوی شبلی نے کہا "آج کل روپے کا بہت توڑا ہے ۔" روپے کے ساتھ توڑے کا لفظ سُن کر اِس قدر خوش ہوئے کہ ساری تکلیف بھول گئے ۔ ریاضی کے پروفیسر بہت ہی شریف اور نیک انسان تھے ۔ سب لوگ اُن کی عزت کرتے تھے ۔ انٹرمیڈیٹ میں میرا ایک مضمون ریاضی بھی تھا اِس لیے مجھے اُن سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا ۔ حاضری لیتے وقت میرا نام "آبدل ہوک" کہہ کر پکارتے ۔ بنگالی زبان میں ہر لفظ گول ہو جاتا ہے ۔ گھڑی: گھوڑی اور بنگالی: بنگولی ہو جاتا ہے ۔ حق بھی ہوک، ہو جاتا ہے ۔ پروفیسر آرنلڈ

کی حیثیت، کالج میں خاص بلکہ اِمتیازی تھی۔ وُہ سچے علم کے طالب اور علم دوست تھے۔ مَیں نے کالج میں اُنہیں کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا۔ وُہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھ میں موٹے دستے کی چھتری لیے جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر آجاتے۔ راستے میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہو مُلّاجی کسی مسجد میں درس دینے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے پہر مغرب سے قبل میرے کمرے میں آجاتے اور مجھے سیر کے لیے ساتھ لے جاتے۔ راستے میں پوچھتے کہ "آج کل کیا کر رہے ہو؟ کیا کچھ لکھ رہے ہو" جب میں بتاتا کہ فلاں موضوع پر لکھ رہا ہوں تو اس کے متعلق مجھ سے بحث کرتے اور بعض کتابوں کی نشاندہی کرتے۔ ایک بار ایسی ہی سیر میں جب اُن کے پوچھنے پر مَیں نے کہا کہ مَیں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھ رہا ہوں تو پوچھا مجھے اس کا خیال کیسے پیدا ہُوا اور اس کے لیے مجھے مسالا کہاں سے ملا؟ دوسرے دن اُنہوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر بھیجے جن میں پروفیسر براؤن نے بابی مذہب پر مضامین لکھے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ میں عالمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں پائی جاتی تھیں۔

ہمارے پرنسپل مسٹر تھیوڈر بیک چھریرے بدن کے، بڑے مُستعد، تیز آنکھیں چمکتی ہوئی، ذہین شخص تھے۔ اِس منصب کے لیے اُن کا انتخاب سیّد محمود نے کیا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے مُمتاز گریجوئیٹوں میں سے تھے اور وہاں کی یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ جب یہ کالج میں آئے تو بالکل نوجوان تھے اور ہم سے خُوب گھل مل گئے۔ ۔ ۔ ۔ کچھ عرصے کے بعد جب اُنہیں ہندوستان کی ہَوا لگی اور یہاں کی تاریخ و حالات سے زیادہ واقفیت ہوئی تو رفتہ رفتہ اُن کا جُھکاؤ سیاست کی طرف ہوتا گیا۔ اُس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کا ملک بھر میں چرچا تھا۔ سر سیّد کی مُخالفت سے ملک میں ایک عجیب ہنگامے کی حالت پیدا ہو گئی

تھی۔۔۔۔۔ یہ ایک طویل بحث ہے یہاں اس موضوع پر کچھ لکھنا بے موقع ہوگا۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، مسٹر بیک کو یہ زرّیں موقعہ ہاتھ آیا اور انہوں نے نیشنل کانگریس کے خلاف خوب زہر اُگلنا شروع کیا۔ مسلمان بہت خوش ہوئے۔ مسٹر بیک میں کچھ کچھ اینگلو انڈین رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ وہ بجائے مائی آرڈر کے مائی حکم فرمانے لگے تھے۔ حکم میں جو تحکمانہ شان ہے وہ آرڈر میں کہاں! یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھتا اور ہر ہندوستانی کو اپنی رعایا۔ جب تک سر سیّد زندہ رہے یہ دبے دبے رہے اُن کے مرنے کے بعد یہ کُھل کھیلے اور کالج کے ٹرسٹیوں تک کو طفلِ مکتب سمجھنے لگے اور اُن پر حکم چلانے لگے۔ گورنمنٹ میں اُن کا رسوخ تھا اور اعلیٰ حکّام سے راہ و رسم تھی، اِس لیے ٹرسٹی بھی اُن سے ڈرتے تھے۔ میرا یہ گمان ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلط نہیں کہ وہ مسلمانوں سے اپنی قوم کے کام لینا چاہتے تھے۔ اِتفاق سے اُسی زمانے میں لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آئے۔ کرزن زبردست امپریلیسٹ تھے اُن کے دماغ میں شہنشاہیت کی بُو سمائی ہوئی تھی۔ مسٹر بیک اُن سے جا کر ملے۔ کرزن بھی کیمبرج کے نامور گریجویٹ تھے اور یونیورسٹی یونین کے صدر رہ چکے تھے۔ بیک کرزن کی گوں کے آدمی تھے۔ یہ شملے میں کرزن سے پینگیں بڑھا رہے تھے کہ وہاں پیچش سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ اگر جیتے رہتے تو کرزن کی حکومت میں بڑے آدمی ہوتے اور بڑا مقام حاصل کرتے۔ اِس خیال کے آتے ہی میرا دل کانپ اُٹھتا ہے کہ نہ معلوم اُس وقت مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا۔ ایک مشہور ہندی دوہے کا ٹکڑا "نا گھر میرا نا گھر تیرا، چڑیا رین بسیرا رے" انہیں بہت پسند تھا اور اکثر پڑھا کرتے تھے۔ یہی اُن کی قبر پر کندہ ہے۔

ابھی مجھے کالج میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہُوا تھا کہ ایک دن میں کیا دیکھتا ہوں

کہ وکٹوریہ گیٹ سے داخل ہوتے ہی پکّی بارک شروع ہوتی ہے اُس کے برآمدے میں کچھ طالب علم کھڑے ہیں اور اُن کے بیچ میں مسٹر بیک تشریف رکھتے ہیں۔ طالب علموں کے ہاتھوں میں لمبی لمبی فردیں تھیں جن پر ناموں کی فہرست تھی۔ طالب علم یہ فہرست مسٹر بیک کو دکھا رہے تھے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ طالب علموں نے شہر کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی تھی۔ اُس زمانے میں سَر سیّد انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف مسلمانوں کے ناموں کی فہرستیں انگلستان کی پارلیمنٹ کو بھیج رہے تھے۔ یہ طالب علم مسٹر بیک سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے اِن فردوں پر نمازیوں سے یہ کہہ کر دستخط لیے کہ ہندو "گاؤکشی" کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور قانون پاس کرانا چاہتے ہیں، ہم اُس کے خلاف گورنمنٹ میں معروضہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر بیک یہ سُن کر ہنسے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور افسوس ہُوا کہ یہ ایک اعلیٰ تعلیمافتہ ذمّہ دار انگریز ایک ایسے فعل پر خوشی کا اِظہار کر رہا ہے جو دیانت اور راستی کے خلاف ہے۔ ۔۔۔۔۔ انگریز بلاشُبہ معاملات میں بہت احتیاط اور دیانت سے کام لیتا ہے لیکن جہاں قومی مفاد کا معاملہ آتا ہے تو ضمیر، اِنصاف اور راستی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ اِس زمانے میں ہمیں اِس کا ایسا تلخ تجربہ ہُوا ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان کے بعض سرحدی اضلاع کے تنازعہ کے چُکانے کے لیے انگلستان کی ہائی کورٹ کے ایک جج کو حکم بنایا گیا اور یہ قرار پایا کہ یہ جو فیصلہ کرے گا وہ ہر دو فریق کو تسلیم کرنا پڑے گا اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکے گی۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ مسٹر ریڈکلف انگلستان کی ہائی کورٹ کا جج ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کرے گا جو راستی اور انصاف کے خلاف ہو۔ اُس نے جو فیصلہ کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ پاکستان اسے اب تک رو رہا

ہے اور نہ معلوم کب تک روتا رہے گا۔ بعد میں قائداعظم نے اِس فیصلے کے خلاف بہت کچھ سخت سُست لکھا اور کہا اور لعنت ملامت کی لیکن کیا ہوتا ہے زبان دے چکے تھے ماننا ہی پڑا[1]۔

مسٹر بیک مُسلمانوں کی سرِشت سے خُوب واقف ہو گئے تھے اور اُن کے لُبھانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے مثلاً کبھی عبا اور تُرکی ٹوپی پہنے آپہنچتے یا کانفرنس کے جلسے میں تقریر کرتے کرتے مُسدّسِ حالی کا کوئی بند انگریزی لہجے میں پڑھتے تو مُسلمان خوشی سے اُچھل پڑتے۔ اُن کا پورا نام تھیوڈر بیک تھا۔ مُسلمان تہور بیگ کہنے لگے۔ البتہ ایک بات ضرور کہوں گا کہ اُنہیں طالب علموں سے بہت ہمدردی تھی۔ اُن کی بہبودی کے لیے یا نوکری دلانے میں کوشش کرتے یا جب کبھی پولیس یا ریلوے اسٹیشن والوں سے لڑکوں کا جھگڑا ہو جاتا اور مار پیٹ کی نوبت آجاتی تو مسٹر بیک ہمیشہ اپنے طالب علموں کی حمایت کرتے۔

کالج جب نیا نیا قائم ہوا تو سرسیّد کا یہ معمول تھا کہ ----- صبح کو کالج کی عمارت، باغ وغیرہ دیکھنے آتے۔ اُس[2] زمانے میں جب کہ اسٹریچی ہال قریب تکمیل کے تھا اور آس پاس کے کمروں کی ابھی بُنیادیں ہی پڑی تھیں، ایک دن مَیں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم مسجد کے ایک کمرے کی بُنیاد پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اِتنے میں سیّد صاحب تام جھام میں آتے ہوئے نظر آئے مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اُتر گئے۔ ہمیں جو دیکھا تو پلٹ کر مجھے فرمایا "اِس کے ساتھ مت پھرا کرو، تم کو شیعہ کر لے گا" میں نے کہا "حضرت اَب تو لوگ شیعہ رہے نہ سُنّی۔" (میرا اِشارہ اُس مذہب کی طرف تھا، جسے عام لوگ نیچری

---

[1] قومی زبان، کراچی، ۱۶ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵ [2] چند ہم عصر، ایڈیشن ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۴۰

کہتے اور اُن سے منسوب کرتے تھے) - فرمانے لگے: "اِس سے ایسا بنا لو تو جانوں"

سیّد محمود کی چیف جسٹس (ہائی کورٹ، الہ آباد) سے اَن بَن ہو گئی تھی اور استعفیٰ[1] دے کر علی گڑھ آگئے تھے - ایک بار جو سیّد صاحب کے پاس گیا تو مجھے اپنے کمرے میں لے گئے - کوٹھی میں سب سے بڑا کمرہ یہی تھا - معلوم ہُوا کہ وُہ چیف جسٹس کا جواب لکھ رہے ہیں - چیف جسٹس نے اُن کے خلاف گورنمنٹ میں ۵، صفحے کی رپورٹ بھیجی تھی - سیّد محمود نے اُس کی تردید میں پانسو ۵۰۰ صفحے کا جواب لکھا - مَیں اُس میں کبھی کبھی شریک ہو جاتا تھا، مثلاً کسی حوالے کی تلاش کرنے میں یا کسی اقتباس کی نقل کرنے میں - تعلیم پر کتاب بھی اُنہوں نے اُسی زمانے میں تالیف کی ایک اور اچھی اور مُفید تالیف بھی شروع کی اور وُہ محمڈن لاء تھی - اس کے پروف کئی بار میرے سامنے آئے - مَیں روزانہ سہ پہر کو سیّد محمود کے پاس چلا جاتا جس روز دیر ہو جاتی تو آدمی کو بھیج کر بُلا لیتے - رات کے کھانے کے لیے روک لیتے اِس طرح کوئی ڈیڑھ سال شب کا کھانا میں سیّد صاحب اور سیّد محمود کے ساتھ کھاتا رہا - کھانے پر کبھی کبھی ایک آدھ اور بھی شریک ہو جاتا" کھانے کی صحبت بھی بہت دل چسپ ہوتی تھی - کھانے کے بعد پھر سیّد صاحب کے ساتھ اُن کے کمرے میں چلا جاتا اور مختلف اُمور اور مَوضوعات پر گفتگو رہتی ------ کبھی چائے آتی تو (سیّد محمود) ایک پیالی مجھے دیتے - میرے زمانے میں چائے کا رواج نہ تھا - مَیں ایک دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیتا تو وُہ میری چائے پی لیتے اور کہتے "سور المومنین شفا" گالیاں بھی کبھی کبھی خوب دیتے تھے - ایک بار مولانا شبلی سے کہنے لگے "مَولانا! آپ بہت دن سے اِدھر نہیں آئے - مَولانا نے کہا: "آپ گالیاں بہت دیتے ہیں -

---

[1] قومی زبان، کراچی ۱۶ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۵

آبرو موتی کی سی آب ہے، آب جاتی رہے تو وہ موتی کچھ بھی نہیں۔" سید محمود نے کہا، "مولانا میں آدمی کو دیکھ کر گالی دیتا ہوں۔" وہ بڑے ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے۔ افسوس شراب نے کہیں کا نہ رکھا۔ رات کو جب میں اُن کے پاس بیٹھا ہوتا تو کچھ کچھ دیر کے بعد وہ غسل خانے میں جاتے اور پی کر چلے آتے۔

غالباً[1] ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالب علم (ہی) تھا۔ مولانا حالی اُس زمانے میں یونین کے پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اُن تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مولوی صاحب اُس زمانے میں "حیاتِ جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی "یادگارِ غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ قیام[2] کالج کے زمانے میں جب مولانا حالی "حیاتِ جاوید کی تالیف میں مصروف تھے تو بعض مقامات کے لیے میں نے کچھ مسالا فراہم کرکے دیا تھا، اگرچہ وہ بہت ہی حقیر تھا۔ بات[3] میں بات نکل آتی ہے جب "حیاتِ جاوید" شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لیے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا[4] مولانا شبلی کے لیے جو اتفاق سے اُس وقت حیدر آباد میں وارد تھے۔ میں نے یہ کتاب لے جاکر اُن کی خدمت میں پیش کی اُس وقت وہاں اور بھی کئی اشخاص موجود تھے مولانا شبلی نے یہ کتاب دیکھتے ہی فرمایا: "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔" مولانا نے کتاب کو پڑھے بغیر ہی یہ رائے دی ...... اُن کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا .... اس کے برخلاف مولانا حالی بڑے صاحب دل آدمی تھے۔ مجھے[5] اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب

---

[1] چند ہم عصر، ۱۵۹ [2] حالی کا ذہنی ارتقاء، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، کراچی ۱۹۵۶ء۔ ص ۱۶۴
[3] چند ہم عصر، ۱۰۷
[4] رسالہ "ادیب" (شبلی نمبر)، ۱۳۰ [5] چند ہم عصر، ۱۶۱

سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت و خصائل کا بزرگ ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ آخر میں اُن کی دو بڑی تمنائیں تھیں ایک تو اُردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اُصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد ہوا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی آب و ہوا بہت معتدل اور خوشگوار ہے پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پُر فضا ہے آپ کچھ دِنوں کے لیے یہاں تشریف لے آیئے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخل اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آکر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر اُن کے فرزند سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب رضامند نہ ہوئے۔ عذر یہ تھا کہ دُور دراز کا سفر ہے، ضعیفی کا عالم ہے۔ طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے ایسی حالت میں اتنی دُور کا سفر خلافِ مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم اِدھر آؤ تو ایک روز کے لیے پانی پت چلے آنا، اُس وقت میں تمہارے ساتھ ہو لوں گا کوئی چون و چرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طُول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔[1]

۱۸۹۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ میں ہوا۔[2] اسی سال اور اسی کانفرنس کے اجلاس میں (سر سید راس مسعود کی بسم اللہ ہوئی۔[3] اس

---

[1] چند ہم عصر، ۱۸۵ [2] چند ہم عصر، ۱۸۶

[3] چند ہم عصر، ۱۸۷

تقریب کے وقت کانفرنس کے تمام نمائندے اور کالج کے اکثر طالب علم موجود تھے...

......تقریب کے خاتمے پر شیرینی تقسیم ہوئی - اُن موتی چُور لڈوؤں کا مزہ مجھے اب تک یاد ہے - ایک روز مَیں سیّد محمود کے پاس بیٹھا تھا - مسعود اندر گھر سے نکل کے آئے تو مَیں نے کہا یہ اب بڑا ہوتا جاتا ہے، اس کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں کرتے، کہنے لگے: "مَیں اسے خود پڑھاؤں گا" - - - - - محمود تو کیا پڑھاتے دادا ہی اُن کے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کرتے تھے - ایک سال مَیں گرمی کی تعطیلوں میں کالج ہی میں رہا - ایک دن سیّد صاحب نے مولوی حمید الدین مرحوم اور مجھ سے فرمایا کہ میرے کُتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں انہیں اگر کسی وقت ترتیب سے لگا دو - - - - - - ایک روز دوپہر کو اُسی کمرے میں ہم کتابیں ٹھیک کر رہے تھے اور سیّد صاحب دوسری طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور مسعود اُن کی بغل میں لیٹا تھا - اِتنے میں سیّد صاحب نے اپنی بھاری گنجیلی آواز میں مسعود کو لوری سُنانی شروع کی - ہمیں اُن کے گانے کی آواز سُن کر اِس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کر سکے اور چُپکے سے دوسرے دروازے سے باہر بھاگ گئے -

اسکول کے معلّمین میں مولوی خلیل احمد صاحب کی دھج بھی نرالی تھی - وُہ عربی کے اُستاد تھے - چھوٹے قد کے ٹخنوں سے اُونچا شرعی پاجامہ، کوتاہ نظر - وُہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے - اُن کا کمرہ وہاں تھا جہاں پکّی بارک ختم اور کچّی شروع ہوتی ہے، دونوں کے بیچ میں تھا - عربی کے فاضل تھے - اِسلامی تاریخ اور جُغرافیہ پر بھی انکی نظر تھی - اپنے کمرے میں بیٹھے یا لیٹے آنکھوں سے لگائے کتاب پڑھتے رہتے تھے جب کمرے کے سامنے سے کسی کے آنے جانے کی آہٹ سُنتے تو کہتے "کون" ؟ کوئی طالب علم یا اُستاد ہوا

۱؎ چند ہم عصر، ۱۸۸ ۲؎ قومی زبان، کراچی ۱۶ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۶

تو چُپ ہو جاتے اور جو کوئی بیرا یا مُلازم ہوتا تو کہتے: "چلم بھر لاؤ" بہت سیدھے سادے شخص تھے۔ تنخواہ ملتی تو چُپکے سے ایک طرف دری کے نیچے رکھ دیتے۔ بیرا کچھ نہ کچھ اُس میں سے چُرا لیتا۔ ایک بار اُنھوں نے کہیں سے آم منگائے اور کمرے میں رکھے۔ لڑکوں کو معلوم ہُوا تو غیر حاضری میں چٹ کر گئے۔ واپس آئے تو دیکھا، آم غائب ہیں۔ کہنے لگے: "آم کھائے مُضائقہ نہیں، گُٹھلیاں تو چھوڑ جاتے۔ مَیں نے یہ آم باغ میں بونے کے لیے منگائے تھے۔" کبھی کبھی چُھٹیوں کے بعد گھر سے آتے تو بہت سی کھیر یا رساول لاتے اور اپنے بعض طالب علموں کو بھی کھلاتے، کھانے کے بھی شوقین تھے۔ جب میں مڈل میں پڑھتا تھا تو مَیں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی، علی گڑھ آکر میں نے دُوسری زبان فارسی لی۔ مَیں خوش تھا کہ مَیں نے فارسی لی اور اس کی بدولت مُجھے شبلی جیسے صاحبِ ذوق اُستاد ملے۔ اُردو بیچاری کی اُس زمانے میں اسکولوں اور کالجوں میں رسائی نہ تھی۔ مولوی خلیل احمد مجھ سے کہا کرتے: "عربی پڑھ لو یہ تمہارے کام آئے گی۔" چُنانچہ اُنھوں نے مجھے اَلف لیلیٰ پڑھانی شروع کی، کہتے تھے: "اُس کی زبان بہت فصیح اور سادہ ہے اور اِس میں قسم قسم کے معاملات کا ذکر آتا ہے۔" عربی سے اُردو میں اور اُردو سے عربی میں ترجمہ کرتا یعنی الف الیلیٰ کا جو سبق پڑھتا اُس کی کچھ سطروں کا ترجمہ اُردو میں کرتا اور دوسرے روز اِس کا ترجمہ عربی میں کرتا۔ صرف و نحو کے قواعد وہ مجھے زبانی لکھوا دیا کرتے تھے، خوب آدمی تھے۔ یہ اچھا ہُوا کہ وُہ اسکول سے کالج میں لے لیے گئے۔ وُہ اسکول کی گوں کے نہ تھے بعد میں شمسُ العلما کا خطاب بھی ملا۔ باتیں کرتے تو اُن کے جملے نامکمل سے ہوتے۔ فعل اکثر نادارد ہوتا تھا۔ اَسما و صفات اور حروف ربط سے مطلب اَدا کر لیتے۔

میرے زمانے میں بورڈروں کی تعداد کوئی تین سو تھی ہندو طالب علم بھی تھے، زیادہ تر ڈے اسکالر تھے شہر سے پڑھنے آتے تھے۔ میرے ہم جماعت بھی کئی ہندو

ہے۔ میرے ہم جماعت جنہوں نے بعد میں نام پایا اور مشہور ہوئے یہ تھے: ڈاکٹر ضیاالدین مولوی حمید الدین، مولوی ظفر علی خاں، حافظ ولایت اللہ، سید محفوظ علی، شیخ عبداللہ، انٹرنس میں سیٹھ یعقوب حسن میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انٹر میں کامیاب ہونے کے بعد وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ سوا[۱] شیخ عبداللہ کے باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شیخ عبداللہ صاحب اس قدر ضعیف اور نحیف ہو گئے ہیں کہ کام سے معذور ہیں۔

وہ کالج جو کبھی مورد لعن و طعن تھا، مسلمانانِ ہند کی تہذیب و تعلیم اور سیاست کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے جو آواز اٹھتی وہ تمام مسلمانانِ ہند کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ اس کالج کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا ایک الگ بحث کا موضوع ہے لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں بیداری اور حیاتِ نو پیدا کرنے میں اس کالج نے جو کام کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔"

○

مولوی عبدالحق نے ۱۸۹۴ء میں ایم۔ او کالج، علی گڑھ سے الٰہ آباد یونیورسٹی کے امتحان میں شرکت کی، لیکن کامیابی کی اطلاع ملنے کے بعد بی۔ اے کی سند لینے وہاں نہیں گئے لطف یہ کہ ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی ہی نے مولوی عبدالحق کو اُن کی علمی خدمات کے صلے میں ڈی لٹ کی ڈگری دی۔ تین چار برس کے بعد ۱۹۴۱ء میں انہیں یہی اعزاز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل ہوا[۲]۔ مگر ان سب سے بڑا اور سب سے پائیدار اعزاز "بابائے اردو" کا خطاب ہے جو قوم نے انہیں دیا۔" (ڈاکٹر ممتاز حسن، اقبال اور عبدالحق، ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۴)

---

[۱] قومی زبان، کراچی ۱۶۔ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۷

[۲] قومی زبان، کراچی، ۱۶۔ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۴۳

[۳] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ہاشمی، ۱۹۵۳ء، ص ۱۱۱

۳

انجمن ترقیٔ اردو سے تعلق

۱۹۱۲ء

علی گڑھ کالج سے مولوی عبدالحق نے ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ مولوی صاحب ہاپوڑ کے پہلے شخص تھے جو انگریزی تعلیم کے لیے کالج میں داخل کیے گئے۔ بابائے اُردو کے چھوٹے بھائی شیخ احمد حسن کے بقول:

اُس وقت کے ماحول اور شدید خاندانی
مخالفت کے پیشِ نظر والد صاحب کا
یہ اقدام بے حد جراتِ مندانہ تھا[1]"

علی گڑھ کے دورِ طالب علمی کے حالات خود مولوی صاحب کی زبانی پیش کیے جا چکے یہاں ایک "واقعہ" مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی کے لفظوں میں سُنیے جس کا تعلق مولوی عبدالحق کی اُردو سے دلچسپی اور اُن کی ادبی زندگی کے آغاز سے ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اُس زمانے (۱۸۸۸ء - ۸۹) میں علی گڑھ کالج میں بہترین اُردو مضمون پر تمغہ لارڈ لینس ڈاؤن دیا جاتا تھا۔ مقابلے میں بھائی صاحب کا مضمون سب سے اچھا قرار دیا گیا اور اُنہیں یہ تمغہ انعام میں ملا۔ اس کے بعد اُن کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے سرسید نے "تہذیب الاخلاق" میں بھی اُن سے کام لینا شروع کر دیا۔ یہیں سے بھائی صاحب مرحوم کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے[2]"

---

[1] اور [2] مضمون: "ابدی بھائی" رسالہ 'اُردو' بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۳

سلسلۂ تعلیم ختم کرنے کے بعد مولوی عبدالحق نے عملی زندگی کا آغاز کس طرح کیا۔ مولوی عبدالحق کے چھوٹے بھائی شیخ احمد حسن نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اُن کا کہنا ہے کہ:

"بی۔ اے کرنے کے بعد سر سید کے ایما پہ نواب محسن الملک نے اپنے خط کے ساتھ حیدر آباد روانہ کر دیا۔ جہاں اُس زمانے میں نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرحوم فنانس منسٹر تھے۔ کچھ ہی روز بعد.... نواب افسر الملک بہادر کمانڈر انچیف، نواب وقار الملک سے ملنے تشریف لائے اور بھائی صاحب کو دیکھا تو اُن کے متعلق دریافت کیا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ علی گڑھ سے نواب محسن الملک کے بھیجے ہوئے ہیں، بی۔ اے پاس اور اچھے ادیب ہیں، کمانڈر انچیف بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں نے مدرسۂ آصفیہ قائم کیا ہے، اُس کی ہیڈ ماسٹری کے لیے مناسب شخص کی تلاش میں تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ میری منشا و خواہش کے مطابق یہ مل گئے۔ (اس طرح) بھائی صاحب کا تقرر بہ عہدہ ہیڈ ماسٹری آصفیہ اسکول ہو گیا اور یہیں سے بھائی صاحب کی حیدر آبادی زندگی کی ابتدا ہوئی جہاں اُنہوں نے اپنی زندگی کے کم و بیش چالیس سال گزارے اور یہی اُن کی زندگی کا سب سے قیمتی حصّہ ہے۔"

(اُردو، بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۳)

مولوی عبدالحق دو تین سال مدرسۂ آصفیہ حیدر آباد دکن کے صدر مدرس رہے۔

اکتوبر ۱۸۹۹ء میں وُہ رسالہ "افسر" سے بھی بحیثیت مُدیر وابستہ ہو گئے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں وُہ اُمورِ عامہ (ہوم سیکرٹری) میں مُترجم بنائے گئے جہاں بارہ تیرہ سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں وُہ ناظم (ڈائریکٹر) تعلیم کے مددگار اور چند ماہ بعد اوائل ۱۹۱۲ء میں صوبۂ اورنگ آباد کے سررشتۂ تعلیم کے صدر مہتمم (انسپکٹر آف اسکولز) مُقرر ہُوئے۔ جامعہ عُثمانیہ کے قیام میں مولوی عبدُالحق کی تحریک اور مساعی کو بڑا دخل ہے[1]۔ صدر مہتمی تعلیمات سے مولوی صاحب کو جامعہ عثمانیہ کے سررشتۂ تالیف و ترجمہ کی نظامت پر ترقی دی گئی۔ چند سال بعد اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج قائم ہُوا تو انہیں اس کا پرنسپل مُقرّر کیا گیا۔ کم و بیش ۳۲ سال تک سرکاری خدمت انجام دے کر مولوی صاحب نے ۱۹۳۰ء میں پنشن لے لی لیکن فوراً بعد انہیں باصرار جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو کا صدر بنا دیا گیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے ایما پر مولوی صاحب نے اِس منصب کو قبول کیا لیکن چند ہی سال بعد زبان کی حفاظت و مدافعت کی خاطر وُہ اِس اعزاز اور خدمت سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے۔

۱۹۱۲ء میں مولوی عبدُالحق "انجمن ترقّیٔ اُردو" کے مُعتمد مُنتخب ہوئے اور بقول مولانا ہاشمی فرید آبادی انجمن، "زندگی کی نئی دُھن اور سب سے بڑا مقصدِ حیات بن گئی"[2]۔ ہاشمی فرید آبادی مرحوم ہی کے نام اپنے ایک خط میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"یہ تم نے کیا کہا کہ مَیں اپنا ذاتی روپیہ کیوں بے دردی سے انجمن پر خرچ کر رہا ہوں۔ تمہارے بھائی یا بیٹے پر خُدانخواستہ کوئی وقت آ پڑے تو کیا تم اُس کی مدد نہ کرو گے اور کیا ایسے وقت میں تم روپیہ کا مُنہ دیکھو گے"۔

(مکتوباتِ عبدالحق، ص ۷۶۴)

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون سید ساجد علی، قومی زبان، کراچی، بابائے اُردو نمبر، اگست ۱۹۶۴ء، صفحہ ۸۶

[2] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقّیٔ اُردو، صفحہ ۲۸

یہ خط ۱۹۲۴ء کا ہے اس سال مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد میں انجمن کا ٹائپ کا چھاپہ خانہ لگایا اور بہت زیربار ہوئے۔ مولوی ہاشمی فرید آبادی کو لکھتے ہیں:

"انجمن کے مطبع نے میرا دوالہ نکال دیا ہے۔ ابھی ایک اور مشین آئی ہے۔ اس کی رقم دینی پڑی اور دوسرے خرچ اور ہیں۔ مَیں نے دو بار موٹر کے لیے رقم جمع کی اور دونوں بار انجمن کی نذر ہو گئی[۱]"

اُٹھارہ برس بعد ۱۹۴۲ء میں مولوی عبدالحق نے اپنا عمر بھر کا اندوختہ انجمن کی نذر کر دیا۔ مولوی ہاشمی فرید آبادی کے بقول:

"یہ چوّن (۵۴) ہزار سکۂ عثمانیہ (=۴۷ ہزار روپیہ انگریزی) سے کچھ زیادہ رقم تھی اور اس اعتبار سے کہ ایک متوسط الحال فرد کی تیس برس کی سخت محنت کی کمائی تھی، لاکھوں کی قیمت اور ایثار و فیاضی کی نادر مثال کا مرتبہ رکھتی ہے[۲]"

حقیقت یہ ہے کہ "انجمن" اور مولوی عبدالحق میں کوئی دوئی نہیں رہ گئی تھی:

"میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہو گیا ہے کہ مَیں اسے اپنی ذات سے جُدا نہیں سمجھتا اور انشاء اللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے، ایسا ہی قائم رہے گا[۳]"

مولوی عبدالحق نے اِس قول کو پورا کر دکھایا۔ وہ تا حیات "چراغِ انجمن افروز" رہے اور کسی لمحے اس سے غافل نہ ہوئے۔

۱۔ مکتوباتِ عبدالحق (مرتبہ جلیل قدوائی)، ص ۷۶، ۲۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، ص ۱۱۳

۳۔ مکتوباتِ عبدالحق، ص ۷۷

۲

بحیثیت "معتمدِ انجمن" دکن میں

۱۹۱۲ء — ۱۹۳۶ء

"اِس برِصغیر کے مسلمانوں کی تمام تحریکوں یعنی تعلیمی، معاشرتی، علمی و ادبی، سیاسی کا سرچشمہ سرسیّد احمد خان کی ذات تھی ...... اُن کے بعد بھی جتنی اِصلاحات، تغیّرات اور منصوبے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے عمل میں آئے، جب ہم اُن کی اِبتدا کا سُراغ ڈھونڈتے ہیں تو اُسے سرسیّد احمد خاں کی مساعی میں پاتے ہیں۔ انجمن ترقّیٔ اُردو بھی سرسیّد ہی کی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ اُن کا سب سے بڑا کام مدرستہ العلوم مسلمانانِ ہند کا قیام تھا۔ جب کالج کی جڑیں قدرے مضبوط ہوگئیں تو انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بُنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم کی ترغیب دی جائے۔

۱۹۰۲ء میں دلّی میں شاندار شاہی دربار ہُوا۔ لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ اُن کی کوششوں سے دِلّی میں اُن دنوں بہار آگئی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی اپنا سالانہ جلسہ اُسی سال دسمبر کے آخری ایّام میں کیا جس کے صدر ہز ہائی نس آغا خاں تھے۔ کانفرنس نے اپنی قرارداد میں چار ذیلی شعبے قائم کیے۔ ایک مدارس کا، دوسرا اصلاحِ تمدّن کا، تیسرا تعلیمِ نسواں کا اور چوتھا اُردو کا، جو "انجمن ترقّیٔ اُردو" کے نام سے مَوسوم ہُوا۔ اِس شعبے کے صدر پروفیسر آرنلڈ اور سیکرٹری مولانا شبلی قرار پائے۔ شروع میں دو سال کام مستعدی اور خوش اسلوبی سے چلا مگر پھر معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ مولانا شبلی نے بد دل ہو کر استعفا دے دیا۔ اُن کی جگہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں حبیب الرحمان خاں شروانی (رئیس حبیب گنج) کا انتخاب ہُوا۔ مگر وہ بھی گھبرا کر الگ ہُوئے اُن کے بعد (اَواخر ۱۹۰۹ء) میں یہ خدمت مولوی عزیز مرزا کے سپرد ہوئی۔ کام کا آغاز کیا ہی تھا کہ اُن کا انتقال ہوگیا، اور کچھ مدت تک یہ شعبہ بالکل معطّل رہا۔"[۱]

---

[۱] خطباتِ عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایڈیشن ۱۹۵۲ء صفحہ ۴۹۸، ۴۹۹

محولہ بالا تحریر "ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیان اپنا" — انجمن کا احوال اور اُس کے "مہاپرش" کی زبان سے، والا معاملہ ہے۔ انجمن کے بارے میں گفتگو کا آغاز محض تبرکاً مولوی عبدالحق کے کلمات سے نہیں کیا گیا۔ اِس کی یوں بھی ضرورت تھی کہ انجمن کے بارے میں مستند تر ہے اُن کا فرمایا ہوا، والا مضمون بھی ہے۔ میں اِمکان بھر کوشش کروں گا کہ مولوی عبدالحق کی زبان میں گفتگو بڑھاؤں۔ اُن کے کسرِ انکسار یا خاموشی کی صورت میں اکابر، ہم نشینوں اور پھر دوسرے فاضل ہم عصروں کی زبان سے بات اُٹھاؤں۔ ترقیٔ اُردو کا شعبہ مولوی عزیز مرزا کے جنت مکان ہونے کے بعد لاوارث رہ گیا تھا، اُس کے بعد کا کچھ احوال مولوی عبدالحق کے ایک معتمد رفیق اور دستِ راست مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی کی زبانی سُنیے:

"۱۹۱۲ء میں برطانوی عہد کا دوسرا (اور آخری) دربارِ دہلی منعقد ہوا جس میں پہلی مرتبہ ایک فرنگی بادشاہ ہندوستان آیا، اور شاہ جہاں کے دارالسلطنت میں اس کی رسمِ تاجپوشی ادا کی گئی اِس موقع پر علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی دہلی میں کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے سربراہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے۔ صاحبزادہ مرحوم نے شعبہ ترقیٔ اُردو کا سیکرٹری جناب مولوی عبدالحق صاحب کو نامزد کیا۔ حاضرینِ جلسہ نے بالاتفاق رائے منظوری دے دی۔ مولوی صاحب موصوف اُنہی دنوں اورنگ آباد دکن میں انسپکٹر آف سکولز مقرر ہوئے تھے۔ علی گڑھ کالج کے پرانے طالب علم اور ادبی حلقوں میں بھی روشناس تھے، مگر صاحبزادہ مرحوم کے حُسنِ انتخاب کی تحسین کرتے وقت اِس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ اُن دنوں کانفرنس کا یہ شعبہ بالکل نیم جان اور غیر اہم رہ گیا تھا۔ اس کے مقاصد بہت بلند رکھے گئے تھے مگر اُن تک پہنچنے کے ذرائع مفقود و مسدود تھے[1]۔"

یہ واقعہ اب ہماری ادبی تاریخ کا مشہور لطیفہ بن گیا ہے کہ جب شعبۂ اُردو کا دفتر علی گڑھ سے

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقیٔ اُردو، صفحہ ۱۹

مولوی عبدالحق کے دیا، اورنگ آباد منتقل ہُوا تو نئے سیکرٹری کو: "ایک پُرانا صندوق ملا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسّی سے کسا ہُوا تھا، اُس میں ایک رجسٹر، چند پُرانے اور غیر مرتبہ مسودات، ایک قلم دوات اور باقی ـــــ اللہ کا نام! یہ تھی کُل کائنات انجمن ترقّیٔ اُردو کی جو اُس نے اپنے مُعتمد چہارم کے حوالے کی۔ ایک رجسٹر اور ایک قلم دوات کو ہاتھ میں لے کر ہندوستان جیسے ملک میں کسی علمی کام کے لیے کھڑا ہونا مولوی عبدُالحق صاحب ہی کا کام تھا[1]" خود مولوی عبدالحق کے بقول انہوں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس بارِ گراں کو اپنے ذمّہ لیا[2]۔

اِس میں شک نہیں کہ یہ کام بے حد اہم تھا لیکن اس کی بجاآوری کچھ آسان نہ تھی۔ اُردو زبان میں علوم وفنون کے فروغ و انتقال کے لیے ایسے اصحاب کی ضرورت تھی جو علومِ مشرقی و مغربی دونوں میں فرد ہوں اور ایسے جامع حیثیات اصحاب نایاب نہیں تو کم یاب ضرور تھے دوسری بڑی مُشکل اِس کام میں سرمایہ بہم پہنچانے کی تھی۔ یہ کام اِس قدر بڑا، متنوع، وسیع اور ایسا پُرپیچ تھا کہ جب تک ہزاروں نہیں لاکھوں کا سرمایہ نہ ہوتا اس کو خاطر خواہ چلانا اور انجام دینا ممکن نہ تھا، لیکن سخت قحط الرجال اور ہزار تہی دامنی کے باوصف مولوی عبدُالحق کے وجودِ سیمابی اور مساعیِ جلیلہ کے طُفیل جلد ہی یہ ادارہ حرکی اور جدلیاتی صورت اختیار کر گیا۔

مولوی صاحب نے علی گڑھ تحریک کی کوکھ سے جنم لیا تھا سر سیّد اور اُن کے رُفقائے کار کے گہوارۂ تمدن میں پرورش پائی تھی اُنہوں نے اپنی ساری قوت و مقاومت، مقدرت و صلاحیت اور وضع و شہرت کو داؤ پہ لگا دیا۔ بعض اوقات اُنہیں ایسے حضرات کے دروازوں پر بھی حاضر ہونا پڑا جن سے کبھی ملنا بھی وُہ عار سمجھتے تھے، لیکن انجمن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑا۔ اس کوچے کی ہر ذلّت کو اُنہوں نے عزّت جانا[3]۔

---

[1] انجمن ترقیٔ اُردو کی کہانی (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) از مولوی غلام ربّانی، صفحہ ۱۳ [2] کیفیت انجمن ترقیٔ اُردو بابت ۱۹۱۳ء، صفحہ ۲ [3] مکتوباتِ عبدُالحق (مرتبہ جلیل قدوائی) خط بنام مولانا غلام رسول مہر، صفحہ ۲۴۸

بلاشبہ انجمن کے معتمد ابتدا ہی سے بڑے منتخب اور باکمال اہلِ علم رہے، لیکن جیسا کہ ابھی اشارہ کیا گیا، جب یہ خدمت مولوی عبدالحق کے سپرد ہوئی تو تنہا وہ ان بزرگ اسماہی کی دولت کے ورثہ دار تھے۔ اِس اثاثے کے علاوہ انجمن کا اپنا کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ یہ صرف مولوی صاحب کی نگہ بلند کا کرشمہ تھا کہ دنیوی لحاظ سے بے مایہ ہونے کے باوجود انجمن بہت جلد اس قابل ہوگئی کہ اپنے پیروں کھڑی ہو سکے۔ اخلاصِ کار اور مقصد سے قرار واقعی محبت کے بغیر یہ ممکن نہ تھا کہ مولوی عبدالحق ہی کے لفظوں[۱] میں کامیابی آسمان سے نہیں اُترتی۔ یہ سب کچھ محنت، صبر اور استقلال کی کرامت ہے، جانیں کھپانی پڑتی ہیں تب کچھ ہاتھ آتا ہے ؎

ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
بہت جانچ لیتے ہیں، دیتے ہیں تب کچھ

اب اس کے بعد کا احوال پھر مولوی عبدالحق ہی کی زبان سے سُنیئے:

"۱۹۱۲ء سے شعبۂ ترقیٔ اُردو میں کچھ جان پڑنا شروع ہوئی، اور مملکتِ آصفیہ کی فیاضانہ امداد سے اسے بڑی تقویت پہنچی۔ اُس کا علمی و ادبی کام آگے بڑھنے لگا اور جگہ جگہ شاخیں قائم ہوئیں۔ یہ کام خاموشی سے ہوتا رہا۔ اُردو کی مخالفت یوں تو ہندی والوں کی طرف سے آج سے تقریباً سو برس پہلے شروع ہوگئی تھی لیکن اس کی رفتار کبھی تیز ہو جاتی اور کبھی دھیمی۔ اُردو بڑی سخت جان ہے۔ یہ بھی اسی رفتار سے مقابلہ کرتی رہی۔ اُردو والوں کو سرسید کا بہت سہارا تھا۔ وہ اُردو کی حمایت میں آخر دم تک لڑتے رہے۔ اُن کا انتقال ہوتے ہی رنگ بدل گیا اور فرقہ پرست ہندی والوں نے زور باندھا۔ اسی زمانے میں سرانٹنی میکڈانل یو۔پی میں لیفٹیننٹ گورنر ہو کر آئے تھے جو پہلے سے ہندی کی طرف مائل تھے۔ اُن سے ہندی والوں کی ہمت اور بڑھی اور اُن کی

---

[۱] خطباتِ عبدالحق، ۲۷

متفقہ کوشش سے اپریل ۱۹۰۰ء میں وہ ریزولیوشن پاس ہُوا جو سرانٹنی میکڈانل کے عہد جبروت عہد کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا۔ اس سے مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ نواب محسن الملک نے جو اُس وقت علی گڑھ کالج کے سیکرٹری تھے، اس ریزولیوشن کی مخالفت کی اور اُردو کی تائید میں ایک بہت بڑا جلسہ لکھنؤ میں کیا جس میں اطراف و جوانب سے اور ہر صوبے کے نمائندے شریک تھے۔ اُس وقت مسلمانوں کی بے چینی اور غیر معمولی جوش و خروش صاف بتا رہا تھا کہ اُنہیں اپنی قومی زبان اُردو سے کتنا عشق ہے۔ نواب محسن الملک بڑے فصیح البیان مقرر تھے۔ اس موقع پر جو تقریر اُنہوں نے کی وہ نہایت پُرجوش اور دل ہلا دینے والی تھی، اور جب اُنہوں نے یہ مصرعہ پڑھا ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اُٹھے

تو جلسے میں کہرام مچ گیا۔ اِس جلسے میں بعض ہندو صاحبوں نے بھی اُردو کی حمایت میں بہت اچھی تقریریں کیں۔

جب اِس جلسے کی کیفیت سرانٹنی میکڈانل کو معلوم ہوئی تو وہ سخت برہم ہُوا، اور اُس نے اپنی حاکمانہ اور جابرانہ قوت سے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ نواب صاحب کو بھی اس خوف سے کہ کہیں اس کا نزلہ کالج پر نہ گرے دست بردار ہونا پڑا[۱]" اور انجمن جو اردو کی حفاظت و حمایت کے لیے قائم کی گئی تھی اور جس کا یہ عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہُوا تھا ٹوٹ پھوٹ کے رہ گئی۔ اُن کی یہ کمزوری نہایت قابلِ افسوس ہے۔ شائد اندیشہ تھا کہ اگر اُنہوں نے اِس پر اصرار کیا تو نہیں کالج کی سیکرٹری شپ سے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ کالج کی حالت اُس وقت بہت نازک تھی۔ اِس لیے مصلحت اِس میں سمجھی کہ اُردو کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں، تاہم اُن کی یہ کارروائی بے اثر نہ رہی۔"[۲]

---

[۱] خطباتِ عبدالحق، ۱۰۵ [۲] چند ہم عصر، ۱۵۰

"۱۹۰۲ء والے سالانہ اجلاس میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے انجمن ترقی اُردو کا شعبہ قائم کیا"

اُس کی شانِ نزول یہی واقعہ تھا۔

کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی ہی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تقویت کا راز بہت کچھ اُس کی مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے عملی قوت کو اُبھارتی ہے اور انسان کے اُن جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت دَرپردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص اور استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی اور تحریک سو بسوئے کامیاب ہو گی۔ مخالفت ہی نے پاکستان بنایا، وَرنہ کیا اتنی جلدی بن جاتا؟ اور مخالفت ہی کے طُفیل میں اُردو کو ترقی نصیب ہُوئی ؀

مولوی عبدُالحق صاحب کے رفیقِ قدیم مولوی غلام ربّانی صاحب نے انجمن کے ابتدائی سولہ سترہ سال کا بڑا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اُن کے بقول جناب عبدُالحق کے انجمن کے معتمد منتخب ہونے تک انجمن کے ارکان تین قسم کے تھے:

۱۔ سَرپرست: اُمراء و رؤسا ملک جو انجمن کو یک مُشت ایک ہزار روپیہ عطا فرمائیں۔

۲۔ ارکانِ مدامی: جو یک مُشت پانسو روپیہ عطا فرمائیں۔

۳۔ ارکانِ شوریٰ: وُہ نامور اربابِ قلم و صاحبانِ علم و فن جنکی خدمت میں انجمن کے ادبی و علمی اُمور مشورتاً پیش کیے جائیں۔

ارکانِ شوریٰ کی فہرست ضرور اچھی خاصی طویل تھی، لیکن اُس وقت تک سرپرست اور ارکانِ مدامی کی فہرست میں کوئی نام نامی درج نہیں ہُوا تھا۔ مولوی عبدُالحق صاحب نے ایک قسم ارکانِ معمولی کی اضافہ کی جن کے لیے لازم تھا کہ ایک روپیہ ماہانہ یا بارہ روپیہ سالانہ عنایت

۱؎ خطباتِ عبدُالحق، ۵۰۲

کریں۔ آپ نے پہلے ہی سال ۱۴۴ رکن بنائے اور پربھنی (حیدرآباد) میں انجمن کی ایک شاخ اور کُتب خانہ قائم کیا۔ دُوسرا اہم کام جو اس سال آپ نے انجام دیا یہ تھا کہ نواب عمادُ الملک کو انجمن کا صدر بنایا۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۱۵ء میں اَرکانِ اعانت کی تعداد ۲۰۳ تک پہنچ گئی اور ساتھ ہی کچھ کتابیں بھی شائع ہوگئیں۔ آپ کے اثر سے ملک کے مشہور اَخبارات میں انجمن کی حمایت میں پُرزور مضامین نکلنے شُروع ہُوئے۔

ابتدا میں نواب عمادُ الملک کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نظام نے انجمن کی سرپرستی قبول فرمائی اور بارہ سو روپے سالانہ منظور ہُوئے ۱۹۱۶ء میں سر اکبر حیدری کی مساعی سے اعلیٰ حضرت نظام نے مُستقلاً انجمن کے لیے پانچ ہزار روپے سالانہ کی امداد مرحمت فرمائی۔ اسی سال علیا حضرت مرحومہ فرمانروائے بھوپال نے پچاس روپیہ ماہانہ کی مُستقل امداد عطا کی۔ اَب ارکانِ اعانت کی تعداد ۴۹۰ تک پہنچ گئی اور کلکتہ، جالندھر اور بمبئی میں انجمن کی شاخیں اور کُتب خانے قائم ہُوئے اور مطبوعاتِ انجمن کی تعداد ۱۶ تک پہنچ گئی جن میں دریائے لطافت، مشاہیرِ یُونان و روما، تاریخِ تمدّن اور فلسفۂ تعلیم جیسی نادر کتابیں شامل تھیں۔ لوگوں کو کثرت سے انجمن کا رکن بنانے اور انجمن کے مقاصد اور مطبوعات کی اِشاعت میں آسانی کے پیشِ نظر ارکانِ اعانت کا سالانہ چندہ بجائے بارہ روپے کے چھ روپے اور اُن کو دورانِ رُکنیت انجمن کی مطبوعات نصف قیمت پر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ چُنانچہ دو ہی سال میں ارکان کی تعداد ۱۲۲۳ تک پہنچ گئی۔ اسی سال (دسمبر ۱۹۱۶ء) انجمن ترقّی اُردو کا ایک عام جلسہ لکھنؤ میں مُنعقد ہُوا۔ جلسے میں ہندوستان بھر کے علمائ و فضلائ، اکابرِ قوم، شُعرا، ادبا، مشائخ اور رُؤسائے عظام تک شریک ہُوئے۔ اِس طرح انجمن کا اشتہار ہو گیا۔

۱۹۱۷ء تک شیدائیانِ اُردو کی تعداد تو خاصی ہو گئی تھی لیکن اَرکانِ دوامی کی فہرست میں کوئی اسمِ گرامی درج نہیں ہُوا تھا۔ اس سال گیارہ بہی خواہانِ اُردو نے اِس مُعزّز رُکنیت کو قبول فرمایا۔

اسی سال اصلاحاتِ علمیہ کی ایک لُغت تیار کرنے کے لیے سرکار نظام نے تین ہزار روپے کی امداد منظور فرمائی۔ اِس سال مطبوعاتِ انجمن میں چار قابلِ قدر کتابوں کا اضافہ ہوا۔ مختلف صاحبانِ اخبار اور تاجرانِ کُتب سے معاملہ طے کر کے سترہ شہروں میں بیس ایجنسیاں قائم کی گئیں جس سے کتابوں کی فروخت میں نُمایاں ترقی ہونے لگی۔ ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدُالحق صاحب نے انجمن کی سفارت پر حاجی مظہر علیم انصاری (مرحوم) کو بنگال، بہار، صوبجات متوسط مالوہ، چھوٹا ناگپور، میواڑ، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے دَورے پر بھیجا۔ اس ذریعے سے ارکان کی تعداد میں اضافہ ہوا اور اُن دُور اُفتادہ خطوں میں انجمن کی شاخیں اور کُتب خانے قائم ہو گئے۔

۱۹۱۹ء میں ارکانِ اعانت کی تعداد میں غیر معمولی اِضافہ ہُوا اور تعداد ۴۳۴ ہوگئی۔ ارکانِ دامی ۴۴ اور انجمن کی شاخیں اور کُتب خانے ۲۰ ہو گئے۔ ملک میں مطبوعاتِ انجمن مقبول ہونے لگیں۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں فلسفۂ تعلیم، علم المعیشت، انتخابِ کلامِ میر اور فلسفۂ جذبات دوسری بار طبع ہوئیں۔ (۱۹۳۰ء تک انجمن کی بعض کتابیں تین تین چار چار مرتبہ چھپیں) ۱۹۲۰ء سے تمام مطبوعات مُجلّد شائع ہونے لگیں جنوری ۱۹۲۱ء کے پہلے ہفتے سے رسالہ "اُردو" کا اجراء ہوا اور انجمن کے حسابات کی تنقیح کا انتظام کیا گیا۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں چند نئی کتابیں طبع ہوئیں۔ ارکانِ دائمی کی تعداد ۸۰ اور اتنی ہی شاخیں اور کُتب خانے قائم ہو گئے۔ انجمن مولوی صاحب کے مکان سے اپنے مکان "اُردو باغ" میں داخل ہوئی۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں بشمول فرہنگ چھ کتابیں شائع ہوئیں۔ انگریزی اُردو لُغت کے لیے ایک کمیٹی مُقرر کر دی گئی۔ اِسی دوران میں مجلس نُظمائے انجمن قائم ہوئی۔

۱۹۲۴ء سے انجمن نے کتابوں کی ایجنسی کا کام بھی شروع کر دیا اسی سال "اُردو باغ" میں ٹائپ کا پریس قائم ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں نواب عمادُالملک کے انتقال پر مجلس نظمائے نے نواب مسعود جنگ کو انجمن کا صدر منتخب کیا۔ ۱۹۲۷ء میں پانچ کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی سال انجمن نے

مدارس کے لیے ریڈریں تیار کرانا شروع کیں۔ انگریزی اُردو لُغت کا ترجمہ مکمل ہُوا۔ نظرِثانی شروع ہُوئی اور بیشتر گراں قدر عطیے میسّر آئے۔

۱۹۲۸ء میں ارکانِ مدامی کی تعداد ۱۰۰ ہوگئی۔ انجمن کی شاخیں اور کُتب خانے ۹۹ تک پہنچ گئے۔ رسالہ "سائنس" کا اجرا ہُوا۔ جدید تالیفات و تصنیفات کے ساتھ ساتھ قدیم کلام نظم و نثر کو محفوظ کیا گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے دریائے لطافت، نکات الشعراء، مثنوی خواب و خیال، تذکرہ شعرائے اُردو (مُصحفی) اور سب رس وغیرہ کے علاوہ بعض دوسری نادر و نایاب کتابیں کھود کھود کر نکالیں اور اُردو زبان کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ قدیم دکنی اُردو کی ترتیب کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب نے قدیم دکنی الفاظ کی فرہنگ بھی مرتّب کی۔ قدیم قلمی نُسخے نہایت تلاش و جُستجو سے نیز مُختلف مقاماتِ دُور دراز کا سفر کر کے مُہیّا کیے۔[۱] "اب اس کے بعد کی داستان مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی زبانی سُنیئے":

"۱۹۳۰ء میں جناب مولوی صاحب اورنگ آباد کالج کی صدارت سے سبکدوش ہُوئے، اور حکومتِ حیدر آباد نے باصرار اُنہیں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو کا صدر مُقرر کیا اور دس برس کے لیے بارہ ہزار روپیہ (سکّہ عثمانیہ) سالانہ کی ایک خاص امداد بھی منظور فرمائی کہ وُہ اُردو زبان کی جدید، کلاں تر لُغت تالیف کریں جس کی مُدت سے خواہش (اور ضرورت) تھی۔۔۔۔ بڑے منصوبوں کے ساتھ پوری مُستعدی سے کام کا آغاز ہُوا۔ مولوی صاحب کے جامعہ عثمانیہ میں حیدر آباد آجانے کے باوجود انجمن کا دفتر و مطبع اورنگ آباد ہی میں رہا لیکن لُغت کا دفتر حیدر آباد میں کھولا گیا۔ جس قدر کام زیادہ ہُوا مولوی صاحب کے منصوبے بڑھتے رہے۔ دس بارہ سال میں لُغت کا اِتنا کچھ سرمایہ فراہم ہوگیا کہ پہلے کسی کے خیال میں نہ آسکتا تھا۔ کتاب تکمیل کو نہ پہنچی؛

---

[۱] مُلخّص مضمون "مولوی صاحب بحیثیت مُعتمد انجمن" مطبوعہ نورس (دوماہی مجلہ عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن ۱۹۳۰ء) صفحہ ۸۱ تا ۱۱۲

چند اجزا حیدر آباد کے سرکاری مطبع میں چھپے تھے کہ "آزادیٔ ہند" کی آندھیوں میں وہ دفتر ہی پراگندہ ہو گیا۔

علی گڑھ کی مجلس مشاورت (اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے فیصلے کے مطابق انجمن ترقی اردو کا مرکز دہلی قرار دی گئی۔ دہلی کو انجمن کی منتقلی ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ اس سے ایک سال پہلے سر سید راس مسعود جو اورنگ آبادی دور میں ۱۹۲۶ء سے صدر انجمن تھے، دنیا سے اٹھ گئے۔ اس اعتبار سے بھی دہلی میں منتقلی سے (زیر صدارت: سر تیج بہادر سپرو) اس کے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔

اجمالی طور پر نظر ڈالیے تو انجمن ترقی اردو صحیح معنی میں اورنگ آباد آکر ہی علی گڑھ کانفرنس کی ماتحتی سے آزاد ہوئی، مستقل ادارہ بنی اور ترقی اردو کے مقاصد استقلال و تسلسل کے ساتھ انجام دیے۔ پچیس برس کی محنت و سعی سے سو کے قریب نئی کتابیں اردو میں شائع کیں۔ دو اعلیٰ درجے کے سہ ماہی رسالے "اردو" اور "سائنس" جاری کیے۔ ان مطبوعات کی تالیف، ترجمہ اور طباعت میں مجموعی طور پر کئی لاکھ روپیہ صرف کرنے کے قابل ہوئی۔ اردو (انگریزی) ٹائپ کا مطبع قائم کیا۔ جا بجا شاخیں، اردو کتب خانے اور مکتب کھولے۔ ۱۹۳۷ء میں ان کی تعداد سو سے زیادہ اور معاونین و سرپرست نوّے کے قریب تھے جن سے معقول عطیات وصول ہوئے۔ انجمن جس وقت علی گڑھ سے اورنگ آباد آئی تو کل کائنات ایک ٹوٹا ہوا صندق تھا اور جب یہاں سے دہلی چلی تو مطبوعات کے ذخائر مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لادے گئے۔ چھاپے خانے کا کثیر بھاری سامان اور کلوں کو حمل و نقل کی دشواری کی وجہ سے اورنگ آباد ہی فروخت کر دینا پڑا۔ جناب مولوی صاحب کا بیش بہا ذاتی کتب خانہ اور لغت اردو کا دفتر جو حیدر آباد سے براہِ راست دہلی گیا بجائے خود ایک اثاثہ الگ تھا۔ یہ تمام ذخائر اور یہ ساری حیرت انگیز ترقی بے شبہ شخص واحد کے اخلاص و ایثار، لگاتار محنت و قابلیت کا ثمرہ تھی[۱]۔"

---

[۱] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، ۵۲-۵۷

۵

اُردو کی اِشاعت و مدافعت میں جہاد

۱۹۳۷ء — ۱۹۴۷ء

پہلی جنگِ عظیم، برِّ عظیم پاک و ہند کی کشت سیاست کے لیے طوفان کا پہلا جھکڑ ثابت ہوئی۔ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے مناقشوں نے اِس تلاطم کو پُرشور کیا۔ آگے چل کر یہ طُغیانی اور طوفان ہندو مُسلم فساد و اختلاف کی صورت میں متشکل ہوا۔ اُس زمانے میں زبان کے مسئلے نے نہایت ناگوار اور اندیشہ ناک صورت اختیار کر لی۔ مولوی عبدُالحق صاحب اِس لسانی یورش کے مقابل اُردو کو بچانے، منوانے والوں کے محاذ کے سپہ سالار تھے انھیں اُردو کی محبت اور مدافعت میں ایک طویل جنگ لڑنا پڑی۔ مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے لفظوں میں "اِن معرکہ آرائیوں نے مولوی صاحب کو خدمتِ علم و ادب کے خلوت کدے سے باہر کھینچ لیا"[1]۔ اِس کی تفصیل اور تقسیم ہند تک انجمن کی کارگذاری کی مختصر رُوداد اور کیفیت خود مولوی عبدُالحق صاحب کے قلم سے مُلاحظہ کیجیے:

"آخر دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب اوّل اوّل (انجمن ترقی اُردو) کی بُنیاد رکھی گئی تو اس کا مقصد اَدبی اور علمی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترجمے، ترتیب و تالیف کے ذریعے اُردو زبان کے اَدبی و علمی سرمائے میں اِضافہ کرنا۔ اِس مقصد کی ۱۹۳۶ء تک پوری پوری پابندی کی گئی[2]"۔ اِبتدا میں انجمن خاموشی سے کام کرتی رہی۔ اس کا مقصد اُردو زبان کی اشاعت و ترقی اور اُردو ادب کو پُرمایہ اور وسیع بنانا تھا۔ اس نے کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہ کی۔ یہ اس کے اُصول اور شعار کے خلاف تھا۔ البتہ جب اس کی مخالفت کی گئی اور اس کے راستے میں روڑے اٹکائے

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، ۵۲ – ۵۷ [2] رپورٹ تیسری کُل ہند انجمن کانفرنس، ناگپور، ۱۱۳

گئے تو اسے مجبوراً مدافعت کرنی پڑی۔ حفاظت اور سلامتی کے لیے مدافعت لازم ہے۔

اِس ضمن میں اُس واقعے کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہُوں، جس نے انجمن کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کی مختصر رُوداد یہ ہے: ۱۹۳۵ء میں مسٹر کنہیا لال منشی[۱] مجھ سے حیدرآباد آکر ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت ہو سکے، آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائیے۔ چوں کہ یہ ادبی معاملہ تھا، مَیں نے منظور کر لیا۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگ پور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہُوا۔ اِس انجمن کا نام "اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد" تھا۔ اس میں ایک مسئلہ پیش ہُوا کہ پرشد کی زبان کیا ہونی چاہیے مجھ سے پوچھا تو مَیں نے کہا: ہندوستانی۔ گاندھی جی نے دریافت کیا کہ مَیں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ مَیں نے کہا اس لیے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا یہ ریزولیوشن ہے کہ کانگریس کی اور مُلک کی زبان ہندوستانی ہوگی، نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور پر یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں۔ مَیں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا رہا تو کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا ہندی سے آپ کی کیا مُراد ہے فرمایا، وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ تو فرمایا وُہ زبان جو بول چال میں ہے، کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے دریافت کیا تو ہندوستانی زبان کیا ہُوئی۔ فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی مَیں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے مَوجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر اُنھوں نے جھنجلا کر کہا کہ مَیں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ مَیں نے عرض کیا جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اُردو کیوں چھوڑ دیں۔ اس پر اُنھوں نے

---

[۱] حکومتِ ہند کے غذائی وزیر: ۱۹۵۱ء

ایسا غلط اور عجیب و غریب جواب دیا جس کی اُن سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ فرمایا مسلمان چاہیں تو اُردو رکھ سکتے ہیں۔ یہ اُن کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور مَیں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اَب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ زمانے کا رنگ کچھ اَور ہے۔

انجمن اَب تک خاموشی سے علمی اور اَدبی کام کر رہی تھی۔ اَب اُسے ایک نئی مہم سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اِس پر غور کرنے کے لیے اُسی سال علی گڑھ میں ایک کُل ہند اُردو کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں علاوہ دوسرے مسائل کے ایک مسئلہ قابلِ غور یہ تھا کہ انجمن کا مستقر کہاں ہو؟ کیونکہ اَب حالات بدلنے سے حیدرآباد میں رہ کر یہ کام حسبِ منشا انجام نہیں پا سکتا تھا۔ اِسی کانفرنس میں یہ طے پایا کہ انجمن کا صدر مقام دِلّی میں منتقل کر دیا جائے۔ ملک میں اس وقت کانگریس حکومتوں کا راج تھا۔ اس لیے اُردو کی طرف سے تشویش پیدا ہو گئی اور انجمن کو ہر علاقے اور مقام پر نظر رکھنی پڑی۔ بمبئی، یوپی، بہار اور خاص کر سی پی کی حکومت سے بڑے معرکے کرنے پڑے۔

جہاں کہیں اُردو پر آنچ آئی اس کے انسداد کی انجمن نے فوراً کارروائی کی۔ جہاں کہیں اُردو مدرسے بند ہو گئے تھے اُنھیں کھلوایا۔ جہاں اَز رُوئے قواعد اُردو تعلیم نہیں ہوتی تھی اُسے جاری کرانے کی کوشش کی۔ وِدیا مندر کے خلاف بہت جد و جہد کرنی پڑی۔ کئی بار وُزرائے حکومت نیز گاندھی جی سے مراسلت کے ذریعے اور بالمشافہ اِس بارے میں کارروائی کی گئی۔ ریاست کشمیر اور جے پور میں ایک مدّت سے پہلے فارسی، اس کے بعد اُردو سرکاری زبان تھی۔ وہاں اُردو کو ہٹا کر ہندی رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ انجمن نے فوراً اس کے متعلق قدم اٹھایا[1]۔ انجمن نے

---

[1] خطباتِ عبدالحق، ۵۰۳ — ۵۰۵

اِس کے علاوہ سرکاری اداروں میں اُردو کے حقوق کے لیے جد وجہد جاری رکھی۔ ڈاک خانوں کے فارم اور ریلوے کے ٹکٹوں پر اُردو لکھوائی۔ سی پی کی اسمبلی میں اُردو تقریروں کی اجازت دلوائی۔ اُردو میں اسمبلی کی رپورٹ لکھنے کی منظوری دلوائی اور اُردو سٹینوگرافرز کے تقرر کرائے۔ غرض اِس قسم کے مختلف کام ہوتے رہے۔ یہ تو مختصر رُوداد اُردو کی مدافعت اور دادرسی کی ہے۔

دوسرا کام اشاعت کا تھا: اس کے لیے انجمن نے مقدور بھر کوشش کی۔ بلا مبالغہ کشمیر سے راج کماری تک اور پشاور سے چاٹ گام تک انجمن کی شاخوں کا سلسلہ پھیلایا۔ خاص کر اُن علاقوں کی طرف زیادہ توجہ کی جہاں اُردو کا رواج نہ تھا یا بہت کم تھا۔ ملیبار میں تقریباً آٹھ لاکھ موپلے آباد ہیں، وُہ اُردو زبان سے ناآشنا تھے۔ وہاں انجمن نے مدرسے قائم کیے، انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ عربوں سے نسبت ہونے کی وجہ سے وُہ عربی کے دلدادہ ہیں۔ عربی مدرسوں میں اُردو تعلیم جاری کی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دو سال کے عرصے میں اُردو کا خاصا رواج ہو گیا۔ کالی کٹ میں اُردو کانفرنس بڑی شان سے ہُوئی اور مُشاعرے ہونے لگے یہاں تک کہ وہاں کے سرکاری مدرسوں میں بھی اُردو کی تعلیم ہونے لگی۔

اِسی طرح نارتھ ارکاٹ، ساؤتھ ارکاٹ، ٹراونکور اور کوچین میں انجمن نے کام کیا اور شاخیں قائم کیں اور راس کُماری میں سمندر کے کنارے مَیں نے خود جا کر اُردو پڑھائی۔ ٹری ونڈرم پہنچ کر ٹراونکور کے دیوان سر سی پی سوامی مدلیار سے ملاقات کی اور ٹراونکور یونیورسٹی میں عربی اُردو کی مسند (چیئر) قائم کرانے کی کوشش کی[1]۔"

"انجمن کے سیکرٹری کی حیثیت سے (سی۔پی، ناگ پور) تو خیر مَیں بارہا گیا لیکن ہندوستان کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی اِسی غرض سے دَورے کیے، بنگال، بہار، یوپی، سندھ،

---

[1] خُطباتِ عبدُالحق، ۵۰۶ — ۵۰۷

کشمیر، گوالیار، رانچی (چھوٹا ناگپور) جنوبی ہند میں مدراس، آندھرا، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، ملیبار، ٹامل ناڈ، ٹراونکور تک گیا اور راس کماری پر جا کر دم لیا۔ لوگ مبالغے سے "کشمیر سے راس کماری تک" کا فقرہ کہا کرتے ہیں، لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک کی خاک چھانی۔۔۔۔ مجھے راس کماری میں بھی اردو بولنے والے ملے۔ ان مقامات پر جگہ جگہ تقریریں کیں۔ اردو مدرسے دیکھے۔ لوگوں کو اردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا۔ انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ مدرسے کھولے معترضین کے جواب دیے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور غلط بیانیوں کی تردید کی۔ جہاں جہاں اردو پر آنچ آئی سینہ سپر ہو کر لڑا۔ کہیں کامیابی ہوئی کہیں ناکامی۔ کامیابی سے پھول کر غافل نہ ہوا اور ناکامی سے آس نہ ٹوٹی۔ برابر کام میں لگا رہا اور یہی میری زندگی کا مشن تھا۔[1]"

اس سے بھی زیادہ مؤثر کام انجمن نے چھوٹا ناگپور میں کیا۔ چھوٹا ناگپور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے رومن کیتھلک مشنریوں کا تسلط تھا اور وہ سارے چھوٹا ناگپور پر چھائے ہوئے تھے۔ کسی دوسری جماعت کی مجال نہ تھی کہ وہ وہاں قدم رکھ سکے یا کام کر سکے۔ انجمن نے جب وہاں کام کرنے کا ڈول ڈالا تو ان کے کان کھڑے ہوئے اور سمجھے کہ انجمن مذہب کی تبلیغ کرنے آئی ہے۔ جب ہم نے انھیں اطمینان دلایا کہ ہمارا یہ منشا نہیں ہم صرف اردو کی اشاعت کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اس غرض کے لیے مقتدر پادریوں اور بشپ سے مل کر اپنا مقصد سمجھایا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا اور بشپ صاحب نے تمام پادریوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے مدارس میں اردو کی تعلیم جاری کر دیں، چنانچہ ہزاروں عیسائی لڑکے اور لڑکیاں لازمی طور پر اردو پڑھنے لگیں۔ چھوٹا ناگپور میں اصل باشندے ابھی تک نیم وحشیانہ حالت میں ہیں۔ انجمن نے ان کے لیے مدارس کھولے اور سینکڑوں لڑکے لڑکیاں اردو پڑھنے لگیں اور

---

[1] رپورٹ تیسری کل ہند انجمن کانفرنس، ناگپور، ۱۱۴

تھوڑے ہی عرصے میں اُنھوں نے اُردو لکھنے اور پڑھنے میں حیرت انگیز ترقی کی۔ رومن کیتھولک ننوں نے اُردو پڑھ کر مڈل کے امتحان پاس کیے۔ خاص خاص پادری وہاں اُردو پڑھ کر تکمیل کے لیے دلّی میں آکر میرے ساتھ رہتے تھے۔ چُنانچہ اُن میں سے ایک پادری نے دلّی کے کیتھڈرل میں اُردو میں سَرمَن دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رومن کیتھولک کیتھڈرل میں اُردو میں سَرمَن دیا گیا۔

لیکن اشاعتِ اُردو کا سَب سے اوّل اَور سَب سے زیادہ کام سی پی میں کیا کیونکہ یہیں گاندھی جی سے معرکے کے بعد انجمن کی کارگزاری کا نیا دَور شروع ہُوا تھا۔ یہاں اتفاق سے ایسے کام کرنے والے مل گئے کہ سی پی کی کایا پلٹ کر دی۔ ہمارے رضا کاروں اور کارکنوں نے سارے سی پی کا دَورہ کیا۔ شہر شہر اور قصبے قصبے میں انجمن کی شاخیں، کُتب خانے اور مدرسے قائم کیے۔ حکومت کو اُردو کی طرف توجہ دلائی[۱]۔"

"انجمن کے بعض سرگرم اَرکان خصوصاً حکیم اَسرار احمد کریوی صاحب اور ابراہیم خاں صاحب، نواب صدیق علی خاں صاحب، نواب مُحی الدین خاں صاحب وغیرہم نے جس جانفشانی، ابےجگری اور ایثار سے کام کیا وُہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں اب اُردو کا عام رواج ہو رہا ہے۔ اُردو، جسے کوئی وہاں مُنہ نہیں لگاتا تھا آج گھروں میں، بازاروں اور جلسوں میں اسی کا بول بالا ہے[۲]۔" "یا تو ایک وقت یہ حالت تھی کہ مُسلمان اُردو بولنے سے شرماتے تھے اور مرہٹی بولتے تھے یا تھوڑے عرصے میں نوبت یہ ہُوئی کہ مرہٹے اُردو بولنے لگے اور اُردو میں تقریریں کرنے لگے۔ ناگپور اُردو کا خاص مرکز ہو گیا۔ ہر ہفتے اور مہینے اُردو کے جلسے ہوتے تھے۔ بڑی شاندار اُردو کانفرنسیں ہُوئیں اور مُشاعروں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔

---

[۱] خطباتِ عبدالحق، ۵۰۷-۵۰۸ [۲] رپورٹ تیسری کُل ہند انجمن کانفرنس، ناگپور، ۱۹۴۱

انجمن نے اچھوتوں کے لیے مدرسے قائم کیے۔ تمام کالجوں میں جن کی تعداد آٹھ تھی اُردو لکچرار مُقرر کرائے۔ یہاں تک کہ مرہٹی عورتوں کے کالج میں بھی لکچرار کا تقرر کرایا۔ لیجس لیٹو اسمبلی میں اُردو میں تقریریں ہونے لگیں اور ان تقریروں میں اُردو فارسی کے شعر پڑھے جانے لگے۔ انجمن کی کوششوں سے اُردو اسٹینو گرافر (مختصر نویس) کا تقرر ہوا۔ اسمبلی کی رپورٹ اُردو میں بھی لکھی جانے لگی۔

ودیا مندر اسکیم کے ضمن میں حکومت سے بڑے بڑے معرکے رہے۔ مسلمان سی۔ پی میں دو ڈھائی فیصد سے زیادہ نہ تھے اور اُن کی حالت بہت پست تھی لیکن اُردو کی اشاعت سے اُن میں عجیب بیداری اور قوت پیدا ہوگئی اور وہ سارے سی۔ پی پر چھا گئے۔ افسوس کہ ہم لوگوں کو اِس کا احساس نہیں کہ اُردو میں کیسی کیسی قوتیں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ صرف زبان ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ جہاں اِس کی اشاعت زیادہ ہے، وہیں قومی عصبیت اور حمیت اور روشن خیالی بھی زیادہ اور جہاں اِس کا رواج کم ہے وہاں قومی عصبیت اور روشن خیالی بھی کم ہے۔

۱۹۳۹ء کا ذکر ہے میں اینگلو انڈینز کے لیڈر سر ہنری گڈنی سے ملا اور اُن سے کہا کہ اب انگریزی حکومت کچھ دن کی مہمان ہے۔ کسی نہ کسی روز یہاں دیسی راج ہوگا، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو۔ آپ لوگوں کو بڑی مشکل ہوگی۔ اگرچہ انگریز آپ کو زیادہ مُنہ نہیں لگاتے مگر آپ ہر چیز میں اُن کی نقل کرتے ہیں اور اپنی طرزِ معاشرت اور نظامِ تعلیم انگریزوں ہی جیسا رکھتے ہیں ہندوستانیوں سے الگ الگ رہتے ہیں اور اُن سے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انگریزی حکومت اُٹھ گئی تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ آپ کو تو ہر حال میں اِسی ملک میں رہنا ہوگا۔ اِس پر آپ کو ابھی سے غور کرنا چاہیے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنا طریقۂ تعلیم بدل دیں اور اسے ملکی حالات کے مُطابق بنائیں خاص کر آپ کے بچوں کو ملک کی زبان لازمی سیکھنی چاہیے۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں لیکن آپ کے لیے اُردو زبان

سب سے زیادہ مُناسب ہو گی۔ کیونکہ آپ کسی خاص مقام یا صوبے میں آباد نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں منتشر ہیں اور اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہر جگہ کام آسکتی ہے۔ یہ سُننے کے بعد اُنھوں نے کہا "مَیں نے بارہا اپنی تقریروں میں اِن باتوں پر زور دیا ہے اور مجھے آپ سے بالکل اتفاق ہے۔ آپ مجھے یہ سب باتیں لکھ کر بھیجیے"۔

مَیں نے خط میں یہ باتیں لکھ کر بھیجیں اور اس کے ساتھ اُردو کی نسبت بعض یورپین عُلمار کی رائیں بھی شامل کر دیں۔ اس کے جواب میں سر ہنری نے مجھے بہت اچھا خط لکھا اور اس میں اُردو زبان کی خوبی اور شیرینی کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ خط وکتابت چھاپ دی جائے اور اس کی کچھ نقلیں اُنھیں بھیج دی جائیں۔ مَیں نے چھاپ کر کوئی دو سو نقلیں اُنھیں بھیج دیں جو اُنھوں نے اینگلو انڈین اور یورپین اسکولوں کے پرنسپلوں اور اینگلو انڈین اور یورپین کلبوں کے سیکرٹریوں وغیرہ میں تقسیم کیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد اُن کی تعلیم گاہوں کے ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں اور اُن کے ایجوکیشن بورڈ کے ممبروں کا ایک جلسہ الٰہ آباد میں ہُوا جس کی صدارت یوپی کے ڈائریکٹر تعلیم نے کی۔ کئی دن کے بحث مُباحثے کے بعد یہ قرار داد منظور ہُوئی کہ وُہ اپنے مدارس میں اُردو زبان کی تعلیم لازمی طور پر جاری کریں گے اور اُردو کے سوا کسی دوسری ہندوستانی زبان کو نہیں پڑھائیں گے۔

اِس کے بعد اینگلو انڈین اینڈ یورپین ایجوکیشن بورڈ نے مجھے اپنی لینگویج کمیٹی کا ممبر بنایا اس کا ایک جلسہ دِلّی میں ہُوا۔ اس میں بحث یہ تھی کہ اینگلو انڈین اور یورپین بچوں کو اُردو کب شرُوع کرائی جائے۔ سب نے اِس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ہم اُردو پہلے ہی سال سے شرُوع کرانا چاہتے ہیں۔ مَیں نے کہا پہلے ہی سال دو زبانیں ایک ساتھ شرُوع نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ اُصولاً دُرست نہیں لیکن وُہ نہ مانے اور کہا کہ جس وقت ہمارے بچے اے۔ بی۔ سی

شروع کریں، اُسی وقت وُہ الف، بے، تے بھی پڑھیں۔ بڑی مُشکل سے وُہ اِس بات پر رضامند ہُوئے کہ پہلے چھے ماہ اُنھیں زبانی اور نقشوں اور سیاہ تختوں کی مدد سے زبان سکھائی جائے اور کوئی کتاب پڑھنے کو نہ دی جائے۔ چھے مہینے کے بعد پرائمر، یعنی اُردو قاعدہ پڑھنے کو دیا جائے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اینگلو انڈین اور یورپین تو اپنے بچوں کو اُردو پہلے ہی سال سے پڑھانا چاہتے ہیں، مگر ہمارے بعض علاقے کے بُزرگ تیسرے چوتھے سال میں بھی اُردو پڑھانے پر آمادہ نہیں۔

مَیں نے بنگال کا بھی کئی بار دَورہ کیا۔ کلکتہ میں انجمن کی شاخ قائم کی لیکن یہ شاخ کبھی سرسبز نہ ہونے پائی۔ مَولوی فضل حق اور جناب خواجہ ناظم الدین صاحبان کی وزارتوں میں بھی حاضر ہُوا اور دونوں حضرات سے اِس بارے میں گفتگو ہُوئی لیکن اِن مُلاقاتوں اور گفتگوؤں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ مَیں اُن کی مُشکلات کو سمجھتا تھا۔ وُہ اس وقت کے حالات اور اپنے منصب کی نزاکت کی وجہ سے کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے کسی طبقے یا فرقے کو شکایت کا موقعہ ملے۔ مَیں بھی یہ نہیں چاہتا تھا اور میری ہرگز یہ خواہش نہ تھی کہ وُہ نصابِ تعلیم میں کوئی ایسا تغیّر و تبدّل کریں۔

بات یہ ہے کہ بنگال میں ہزاروں کی تعداد میں مکاتب تھے (اور اب بھی ہیں) جن میں مُسلمان بچّے تعلیم پاتے تھے۔ اُن کے نصاب میں اُردو بھی داخل تھی اور نظامِ اوقات میں اُردو کے لیے بھی وقت مُقرر تھا مگر پڑھائی نہیں جاتی تھی۔ میری درخواست یہ تھی کہ پڑھائی کا بھی انتظام کر دیا جائے۔ اُن کا عُذر یہ تھا کہ پڑھانے کے لیے اُستاد نہیں ملتے۔ مَیں نے عرض کیا کہ مَیں کلکتہ ہی میں ایک ٹریننگ اسکول قائم کردوں گا جس میں آپ ہی کے اُستادوں کو اُردو پڑھانے کے لیے تیار کر دیا جائے گا۔ اِس کے جواب میں فرمایا کہ اِس میں تو گورنمنٹ

کی تشکی ہوگی ہم خود ہی انتظام کریں گے۔ اِس کا مَیں کیا جواب دے سکتا تھا اور اِس وعدے کا جو انجام ہونے والا تھا اُسے بھی مَیں جانتا تھا۔

مَیں نے اس کے جواب میں یہ کیا کہ دلّی کے عربی مدارس میں جتنے بنگالی طالب علم تھے، اُن سب کو جمع کیا۔ اُن کی تعداد ایک سو پچاس سے کم نہ تھی۔ اُن سے مَیں نے کہا کہ آپ کئی کئی سال تک اِن مدارس میں تعلیم پاتے ہیں آپس ہی میں ملتے جلتے ہیں اور دلّی والوں سے میل جول نہیں رکھتے، یہ اچھی بات نہیں۔ یہاں کے قیام سے آپ کو فائدہ اُٹھانا چاہیے اور کچھ نہیں تو یہاں کی زبان اچھی طرح سیکھ لی جائے اور یہ بہت آسان ہے۔ اُنھوں نے کہا ہمارے نصاب میں اُردو داخل نہیں اس لیے اِس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مَیں نے کہا اچھا، اگر ہم اُردو پڑھانے کا انتظام کریں تو کیا تم اس کے لیے تیار ہو، اُنھوں نے کہا بڑی خوشی سے۔

چنانچہ اس کے بعد ہی مَیں نے مسجد فتح پوری میں دو کمرے لے کر شب کو ان کے پڑھانے کا انتظام کر دیا۔ چند ہی مہینے میں وُہ بہت اچھی اُردو لکھنے پڑھنے لگے۔ اِسی زمانے میں ڈھاکے سے حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم دلّی تشریف لائے۔ ایک شب میں اُن کو اِن طالب علموں سے ملانے لے گیا۔ حکیم صاحب نے جب اُن کی تقریریں سُنیں اور مضامین دیکھے تو بڑی حیرت ہُوئی بعض قابل طالب علموں کو اُنھوں نے انعامات تقسیم کیے۔ مَیں نے اُستاد تو تیار کر دیے مگر اُن کا تقرّر میرے ہاتھ میں نہ تھا۔ یہ نہایت مختصر کیفیت اِشاعت کی ہے۔

تیسرا مقصد انجمن کا اُردو زبان و اَدب کو وسیع اور پُرمایہ بنانا تھا۔ اِس میں بھی انجمن کا کارنامہ بہت قابلِ ستائش ہے۔ تقریباً ۲۵۰ کتابیں شائع کیں جن میں ادب، تاریخ، فلسفہ، سائنس، لُغات، اِصطلاحات، صناعت تعلیم، سوانح، معلوماتِ عامہ، معاشیات، صرف و نحو، سیاسیات، تنقید وغیرہ کی اعلا پائے کی تصانیف شامل ہیں۔ اِصطلاحاتِ علمیہ کی کئی

جلدیں اور اِصطلاحاتِ پیشہ وَراں، آٹھ جلدوں میں شائع کیں۔ انگریزی اُردو کی جامع لُغات، وضع اِصطلاحات، دُنیا کے اَدبیاتِ عالیہ کے ترجمے شائع کیے۔ اُردو شُعراء کے قدیم تذکرے جن کے نام صرف کتابوں میں نظر آتے ہیں تلاش کر کے شائع کیے۔ اُردو کے قدیم مخطوطات کئی ہزار کی تعداد میں بڑی جُستجو سے جمع کیے اَور اُن میں سے بعض طبع کیے اور اُن پر مضامین لکھے۔ اِن سے اُردو کی تاریخ کی کایا بدل گئی[1]۔"

"اَیسے قدیم تذکرے جن کے نام کتابوں میں کہیں کہیں ملتے تھے مگر اُن کا وجود ناپید تھا، بڑی جُستجو اور صرفِ کثیر سے بہم پہنچائے۔ ان میں سے بعض کا دُنیا میں صرف ایک ہی نُسخہ تھا اور بعض کے دو ایک سے زیادہ نہ تھے۔ یہ تذکرے ہمارے قدیم شُعرا کی سیرت، اُن کے طرزِ بیان اور اُس زمانے کی مُعاشرت و تمدّن کے سمجھنے اور صحیح تاریخِ اَدب لکھنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ انجمن نے ان سب کو صحت و احتیاط کے ساتھ مُرتب کر کے شائع کیا۔ نیز انجمن نے اُردو زبان کی قدیم کتابوں کی اشاعت اور یا اُن پر تنقیدی تبصرے لکھ کر مُلک کو اُردوئے قدیم سے روشناس کیا اور اُردو زبان کی تاریخ ادب میں انقلاب پیدا کر دیا جس سے بقول ایک فاضل نقّاد کے اُردو کی عمر میں دو سو سال کا اضافہ ہو گیا۔ ان کتابوں سے اِبتدائی زبان کی کیفیت اور ارتقائی نشوونما کی حالت معلوم ہوئی ہے۔ زبان و اَدب کے مُورّخ (اور مُتعلم) کے لیے ان کا مُطالعہ ناگزیر ہے۔ ان میں سے اکثر وہ کتابیں ہیں جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا[2]۔"

انجمن کی طرف سے مولوی عبدُالحق صاحب نے کچھ اخبار اور اَدبی علمی جرائد بھی جاری کیے۔ یہ اَپنی نوعیت کے مُمتاز اور مُنفرد پرچے تھے اور ان کا اپنا ایک خاص معیار تھا۔ اِس سے قطع نظر اُردو کے قدیم مخطوطات، کُتب اسناد اور علم و فن

---

[1] خُطباتِ عبدُالحق، ۵۰۸-۵۱۴ [2] رپورٹ تیسری کُل ہند انجمن کانفرنس، ناگپور، ۱۲۰

کی اُمہات کتب پر مشتمل ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا گیا، جس میں سکوت و سکون سے تحقیق و تسوید اور تالیف و تہذیب کا کام کرنے کی وہ فضا پیدا کی گئی جو اہلِ علم کو اور کہیں میسر نہیں آسکتی تھی۔ تلاش و تحقیق کی طلب میں لوگ دُور دُور سے آتے اور بالعموم ہوتا یہی کہ گوہرِ مقصود و مُراد پا کر ہی لوٹتے۔

"اِس کے علاوہ دُنیا کی متعدد اُمہاتِ کتب کے ترجمے شائع کیے۔ ان میں عربی، سنسکرت، فارسی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ نیز سائنس کی مختلف شاخوں، فلسفہ، تعلیم، تاریخ، سوانح، حفظانِ صحت، معاشیات، تنقید اور دیگر علوم پر بہت سی کتابیں شائع کیں، یہ ایک بیش بہا خزانہ ہے جو انجمن کی بدولت اُردو ادب کو حاصل ہُوا۔ کسی ادارے نے اُردو دان طبقے کے لیے علمی و ادبی معلومات کا ایسا ذخیرہ بہم نہیں پہنچایا[1]۔"

"یہ سب کچھ کیا لیکن ۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات میں اِس سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اُس زمانے میں جن وحشیانہ حرکات اور بربریت کا ظہور ہُوا اُنھیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بیچارہ خواہ مخواہ بدنام ہے۔ وہ اِنسان کی قساوتِ قلبی، ظلم و جبر، غارت گری و خوں ریزی کو نہیں پہنچتا۔ اِس لپیٹ میں انجمن بھی آگئی۔ اُس کا تمام ساز و سامان تباہ کر دیا گیا۔ اُس کا ایک کارکن اور اُس کے بال بچے قتل کر دیے گئے۔ کتب خانے کا بیشتر حصّہ جو بچ رہا تھا، اُس کے لانے کی اجازت نہیں ملی۔ کئی لاکھ کی مطبوعات وہیں چھوڑنی پڑیں اور نقدی سرمایہ بھی ضبط ہوگیا۔ انجمن ایک لُٹے پٹے قافلے کی طرح پاکستان پہنچی اور کراچی آکر اطمینان کا سانس لیا[2]۔"

---

[1] رپورٹ تیسری کل ہند انجمن کانفرنس، ناگپور، ۱۲۱

[2] خطباتِ عبدالحق، ۵۱۴

مولوی عبدالحق اور انجمن کی ہجرت

۱۹۴۷ء — ۱۹۴۸ء

"انجمنِ حق" کی حکایت دراز ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں اتنا قصے کی لذت کو دخل نہیں جتنا اس کے زمانی پھیلاؤ کا قصور ہے اس لیے کہ یہ برس دو برس کی بات نہیں قریب قریب ایک صدی کی رُود ولِ جُنوں ہے۔!

انجمن، برِعظیم پاک و ہند میں اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور تہذیب و تعمیر کا سب سے بڑا اور سب سے پرانا ادارہ ہے۔ ایک زمانے تک انجمن خاموشی سے علمی و ادبی کام کرتی رہی۔

تیس پینتیس برس تک خاموشی سے اُردو زبان کے علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کرتے رہنے کے بعد مولوی عبدالحق کو میدانِ کارزار میں اُترنا پڑا ۱۹۳۵ء سے تقسیم تک خُوب خُوب معرکہ آرائیاں ہوئیں۔

اِس موقع پر انجمن کے پاکستانی دَور کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور انجمن کی پاکستان ہجرت کی داستان بھی رقم کر دی جائے۔ مولانا سید ہاشمی فریدآبادی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ یہ تفصیل:

"انجمن کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھنے کے علاوہ تقسیم ہند کے فسادات کا مُطالعہ کرنے والوں کے واسطے بھی نہایت مُفید (ہو گی)[1]"

یہ تفصیل خُود بابائے اُردو کی اپنی یادداشتوں سے مُرتبہ ہمیں مل بھی جاتی ہے اور

---

[1] انجمن کی پنجاہ سالہ تاریخ، صفحہ ۱۶۷

یہ ہماری خوش قسمتی ہے، اِس لیے کہ ہجرت کی یہ داستان صحیح سیاق و سباق کے ساتھ انجمن کی روحِ رواں سے بہتر کوئی اور لکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

ذیل میں انجمن کی پاکستان ہجرت کی یہی کہانی بابائے اُردو کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔ اِسے مَیں نے انجمن کی پنجاہ سالہ تاریخ (مرتبہ سیّد ہاشمی فرید آبادی) کے چھٹے باب (نوشتہ مولوی عبدالحق) سے اِختصار کیا ہے:

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو[۱]

"انجمن[۲] کے مکان (نمبر ایک دریا گنج، دہلی) میں یوں تو پہلے ہی سے مہربانوں اور مہمانوں کی آمد رہتی تھی، لیکن جب دلّی کی آبادی اور رونق اور اس کی اہمیت بڑھنے لگی تو ہمارے مہمانوں کی چہل پہل بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی۔ ہمارے کمرے بھرے پُرے نظر آتے تھے۔ اُن میں لیگی بھی تھے کانگرسی بھی، خلافتی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی۔ کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی، اہلِ علم بھی تھے اور طالب علم بھی۔ گاندھی جی کے خاص مُعتقد اور چیلے بھی تھے اور اُن کے مُخالف بھی۔ ہندو بھی تھے، مسلمان بھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں سیاست سے یا دوسرے کاروبار سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اگرچہ یہ مُختلف خیالات اور مُختلف اُصول کے لوگ تھے، مگر اُردو کے بہی خواہ اور انجمن کے ہمدرد تھے اور جو جس سے بن پڑ سکتا تھا، وُہ ہماری مدد کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا۔ اس لیے وُہ مجھے سب عزیز تھے۔ ایک بڑی خوبی اِس محبت میں یہ تھی کہ نہ مَیں اُن کے معاملات میں دخل دیتا تھا نہ وُہ میرے کام میں ہارج ہوتے تھے۔ مَیں بڑے اطمینان سے اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ اِس لیے ان صاحبوں کا آنا مجھے کبھی ناگوار نہ ہوتا، بلکہ بڑی خوشی ہوتی تھی اور

[۱] اور [۲] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن صفحہ ۱۶۷ اور ۱۶۹ تا ۱۷۲ (علی الترتیب)

ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد اُن سے باتیں اور گپ شپ کرنے میں بڑا لُطف آتا تھا۔ دن بھر کی تھکن اور کوفت دُور ہو جاتی تھی اور دُوسرے دن کام کے لیے ہشّاش بشّاش تیار ہو جاتا تھا۔ کام کرنے والے کے لیے ایسی تفریح ٹانک کا کام دیتی ہے پھر ایسی صحبت ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔ اب اُن دنوں کی یاد میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔"

"جولائی، ۱۹۴۸ء کی ۱۴ تاریخ اور پیر کا دن تھا حسبِ معمول اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دن میں کھانا کھاتا نہیں، اِس لیے بے تکان کام کرتا ہوں۔ تیسرے پہر یکایک میرے ایک عزیز مہمان جو کئی روز سے ٹھہرے ہوئے تھے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے تیار ہو جائیے آپ کو میرے ساتھ (حیدرآباد) چلنا ہوگا۔ میں آپ کا ٹکٹ خرید چکا ہوں۔ کل صبح ہوائی جہاز جاتا ہے۔ میں تیار ہو گیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ وہ ریل سے میرا سامان لے کر حیدرآباد آجائے۔ یہ پندرہ جولائی منگل کا دن تھا۔ اُسی روز ہم دوپہر کے بعد حیدرآباد پہنچ گئے۔ وہاں مجھے بعض معاملات طے کرنے تھے۔ ان تمام کاموں سے آخر اگست تک بہت کچھ فراغت ہو گئی، اب دلّی کا قصد کیا۔

۳ ستمبر کی شام کو گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ہوا۔ وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دِلّی جانے کا اِرادہ تھا۔ اس سفر میں سیّد علی شبّر حاتمی میرے ہمراہ تھے۔ ۵ ستمبر کی شب کو بھوپال پہنچے اِسٹیشن پر میرے کرم فرما مہربان شعیب قُریشی صاحب ملے ۔۔۔۔ اُنھوں نے کہا دلّی کے حالات آج کل خراب ہو رہے ہیں۔ ایسے وقت میں جانا خلافِ مصلحت ہے ۔ آخر یہ طے پایا کہ چند روز بھوپال میں قیام کرکے انتظار کروں۔ اگر وہاں کے حالات قابلِ اطمینان پائے جائیں تو شوق سے چلا جاؤں، ورنہ اِس خیال کو ترک کر دوں۔ تین چار روز ہی کے بعد جو خبریں آئیں وہ بہت ہی پریشان کُن تھیں، جس ریل سے میں بھوپال آیا اُسی میں حیدرآباد کے چند

نوجوان طالب علم مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ جا رہے تھے، اُن میں سے جو دِلّی کے رَستے گئے، وہ رَستے ہی میں قتل کر دیے گئے۔ شعیب صاحب کا فرمانا صحیح نکلا۔

بھوپال میں پڑے پڑے بارہ روز ہو گئے تھے.... ۱۸ ستمبر کو انجمن کے کارکنوں کے خط پہنچے کہ بَلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا۔ تمام سامان اور مال و اَسباب لوٹ لیا اور غارت کر دیا۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی اَمان میں ہے۔ یہ خط پڑھ کر مجھے بے حد پریشانی ہُوئی، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

سَب[1] سے زیادہ الم ناک سانحہ یہ تھا کہ جب لُٹیروں نے انجمن پر حملہ کیا تو جو ملازم اُس وقت مکان میں رَہ گئے تھے وُہ اِدھر اُدھر بھاگ کر جان سَلامت لے گئے لیکن ہمارا ایک بُڈّھا کاتب اپنی جگہ سے نہ ہِلا۔ ہر چند دوسرے مُلازموں نے اُسے ساتھ لے چلنے کے لیے کہا مگر وُہ نہ مانا۔ اُس کی بیوی علیل تھی، اِس لیے وہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ظالموں نے اُسے اور اُس کے بیوی بچوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ یہ بہت قابل اور فرض شناس کاتب تھا اور اپنا کام خاموشی سے، بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ کرتا رہتا تھا۔ اِس واقعے سے میرے دل کو سخت رنج اور تکلیف ہُوئی۔ گاندھی جی اُس زمانے میں دِلّی آ گئے تھے اور قتل و غارت اور خُون ریزی اور باہمی منافرت کے جو شعلے بھڑک رہے تھے، اُن پر پانی چھڑکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اُس وقت مجھے سَب سے بڑی فکر اُن کتابوں کی تھی جو میرے کمرے میں تھیں، اور کتاب خانے کی جان تھیں۔ مَیں چاہتا تھا کہ خُود جاؤں اور دیکھوں کہ کیا گیا اور کیا رہا اور کیا بچا، لیکن شعیب صاحب اور دوسرے اَصحاب سَب مانع آئے کہ یہ وقت دِلّی جانے کا

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن صفحہ ۶۷–۱۷۵

نہیں۔ دلّی سے (کچھ) خط بھی اِس مضمون کے آئے کہ وہاں جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ ناچار دل مسوس کے رہ گیا۔ بھوپال میں خالی پڑے رہنا مُناسب خیال نہ کیا۔ اِتنے دن بھی جو وہاں لگ گئے تو وجہ یہ تھی کہ ملیریا نے آدبوچا تھا۔ اچھا ہوتے ہی ۲۵ ستمبر کو حیدرآباد چل دیا۔ وہاں جو کام باقی رہ گیا تھا، اُسے سمیٹنا تھا۔ وہاں پہنچ کر کام شروع کیا۔ دلّی اُن دنوں مصائب و آلام کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ قتل و غارت اور خوں ریزی کا بازار گرم تھا جس کے سامنے نادر شاہ کا قتلِ عام اور غدر کے مظالم ہیچ تھے۔

گاندھی جی کے عبادتی جلسوں میں نہ عبادت کا تقدّس باقی رہا تھا اور نہ رُوحانیت کی روشنی، اب وُہ جلسے کانگرس کا ادنیٰ درجے کا سیاسی پروپیگنڈہ ہو کے رہ گئے۔ جونا گڑھ کے حملے کو اُنہوں نے جائز قرار دیا اور کشمیر پر (حملے کے لیے) فوجوں کو اپنی دُعاؤں کے ساتھ روانہ کیا۔ وُہ اہنسا جس کا غلغلہ سارے عالم میں مچا ہُوا تھا اور جس کی بنا پر گاندھی مہاتما مثلِ مسیح اور بُدھ سمجھے جاتے تھے، اُس کا خاتمہ جمنا کے کنارے پر ہُوا۔ معلوم ہُوا کہ یہ اُصول نہ تھا بلکہ وقت کی مصلحت تھی جس کی حیثیت ایک سیاسی چال سے زیادہ نہ تھی۔ ۵ر اکتوبر کو مَیں نے گاندھی جی کی خدمت میں اسی بارے میں ایک طویل خط لکھا اور اس کا اُنہوں نے جواب دیا۔ اس کا ذکر یہاں مُناسب نہ ہوگا۔ یہ کسی دُوسرے وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔

مَیں حیدرآباد میں پڑے پڑے گھبرا گیا تھا اور دلّی جانے کے لیے بے چین تھا۔ آخر ۲۴ر اکتوبر کو بھوپال روانہ ہو گیا۔۔۔۔ ۸ر نومبر کو سیّد علی شبّر، حیدرآباد سے دلّی روانہ ہو گئے اور ۹ر نومبر کو۔۔۔ ہم مولانا (ابوالکلام آزاد) کے مہمان رہے۔ دوسرے دن یعنی ۱۰ر نومبر کو ہم ایک دریا گنج انجمن کا مکان دیکھنے گیا۔ جب اسے دیکھا تو مکان نقشہ ہی دُوسرا نظر آیا، کہ بھارت

لہ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن صفحہ ۸۲ — ۱۷۷

انشورنس کمپنی لاہور نے قبضہ کر رکھا ہے۔

میراجی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری اُن کتابوں کا کیا حشر ہُوا جو میرے کمرے میں تھیں جس کمرے میں مَیں کام کرتا تھا وُہ بہت بڑا اور وسیع تھا۔ کوٹھی بھر میں اُس سے بڑا کوئی ہال نہ تھا۔ اُس میں کتابوں کی مُتعدد الماریاں تھیں۔ کُھلی الماریوں کے سوا دو بڑی فولادی الماریاں، جن میں خاص خاص نادر قلمی نُسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسخ، غالب، سر سیّد، حالی، محسن الملک، اقبال، سر تیج بہادر وغیرہ کے خُطوط اور اسی قسم کی بہت سی عزیز اور بیش قیمت اشیا رتھیں۔ ان کے علاوہ کئی بڑے بڑے صندوق تھے جن میں میرے نوٹ اور یادداشتیں مُختلف قسم کی اور خاص کر اُردو لُغات کے مُتعلق بہت سامان، الفاظ کی اصل کا تحقیقی سرمایہ، اُردو زبان کی تاریخ کی یادداشتیں اور مضمون اور اُردو ہندی تنازعہ کے مُتعلق بہت سے قدیم کاغذات (میرا ارادہ اس تنازعہ کی تاریخ لکھنے کا تھا) اور بہت بڑا حصّہ اُردو لغات کے صاف کیے ہُوئے مسوّدوں کا تھا — اس سے ملا ہُوا ایک کمرہ تھا جس میں میرے کپڑوں کی الماری اور صندوق تھے۔ کپڑے اور دوسری چیزیں جو اُس کمرے میں تھیں وُہ تو لُٹیروں نے سب لُوٹ لیں، جو صندوق بڑے، نئے اور اچھے تھے وُہ بھی لے گئے، باقی وہیں چھوڑ گئے۔

بڑے کمرے میں کاغذات کے جو صندوق تھے وُہ اُنہیں بہت پسند آئے۔ کاغذات تو اُنھوں نے وہیں پھینک دیے اور صندوق لے کر چلتے بنے۔ فولادی مُقفل الماریوں پر اُن کی للچائی نظریں پڑیں اور سمجھے کہ اُن میں ضرور مال و زر ہوگا۔ پتھر مار مار کر اُنہیں توڑا۔ جب اِن کتابوں اور کاغذوں کے سوا کچھ نہ ملا تو بڑی مایوسی ہوئی اور غُصّے کی جھانج میں وُہ سب کتابیں اور کاغذ نکال نکال کر باہر پھینک دیے۔ کتاب خانے کے کمروں میں زیادہ

گنجائش نہ رہی تھی، اس لیے دو فولادی مُقفّل الماریاں کھانے کے کمرے میں رکھوادی تھیں۔ اُن میں اُردو لُغات کے پرچوں (کارڈوں) کے بنڈل بھرے پڑے تھے۔ انہیں پرچوں پر سے لُغات کا مسوّدہ تیار کرتا تھا جو نظرِ ثانی اور ترمیم و اصلاح کے بعد مُبیّضے کے لیے کاتب کو دے دیا جاتا تھا۔ میرے کھانے پینے کا سامان اور ظروف وغیرہ لُوٹ ہی لیے گئے تھے لیکن مُقفّل الماریوں کو دیکھ کر قیاس کیا کہ ان میں ضرور قیمتی اشیاء ہوں گی انہیں توڑا تو یہاں بھی وہی ناکارہ کاغذ نکلے جو اُنہیں دوسرے کمروں میں ملے تھے۔ ان میں کچھ قلمی بیاضیں بھی تھیں، اُن کا بھی وہی حشر ہوا۔ اُٹھا اُٹھا کر فرش پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتّے"

بھارت کمپنی کو کمروں کی ضرورت تھی اور مالک کو کرایہ کا لالچ لہٰذا کمرے خالی کرنے کے لیے اُنہوں نے یہ سب چیزیں جو میرے کتاب خانے کی جان تھیں، بے دردی سے صحن میں کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیں، جہاں وہ کئی روز تک پڑی رہیں۔ بہت سے کاغذ ہوا میں اُڑ گئے اور کچھ آنے جانے والوں کی رَو مذن میں آگئے اور جو کتاب یا کوئی چیز پسند آئی، مالِ غنیمت سمجھ کر لے لی۔ ان میں بعض نہایت خُوشخط قدیم قرآن شریف تھے وُہ پھاڑ ڈالے۔ قدیم اُردو کتابیں خطِ نسخ میں لکھی ہوتی ہیں، اُنہیں بھی وُہ قرآن سمجھے اور پھاڑ ڈالیں۔ نیچے کمرے، رسالوں اور اخباروں سے بھرے پڑے تھے مالکِ مکان نے اپنی مہربانی سے وُہ سب اخبار اور رسالے اور بہت سی ردّی اور صحن میں باقی ماندہ پڑی ہُوئی کتابیں اور کاغذات ڈھو کر باورچی خانے، غُسل خانوں، گدام، برآمدوں اور کتاب خانوں کے بغلی کمرے میں پھنکوا دیے۔ ردّی کے یہ بڑے بڑے انبار جگہ جگہ پڑے تھے۔

کتاب خانے کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی لُٹیروں کے قدم آئے تھے الماریوں کی کتابیں درہم برہم کر دی تھیں، ورکچھ نیچے پڑی تھیں اور جو الماریاں مُقفّل تھیں، اُن کے تالے بھی

توڑ کر معائنہ کیا اور کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیں اور جو پسند آئیں وُہ نکال کر لے گئے۔ اب ہم نے ردّیوں کے ڈھیروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا۔ کسی کتاب کا کوئی کاغذ ایک جگہ اور کوئی دوسری جگہ ملا۔ اِس تلاش اور چھٹائی میں کئی مہینے لگ گئے۔ اِس کام میں چودھری رحم علی الہاشمی رفیق الدین احمد، محمد یعقوب، مَیں اور بعد میں حامد علی صاحب برابر مصروف رہے بعض نُسخوں کے کاغذات جو مختلف ردّیوں میں ملے جوڑ جوڑ کر الگ کیے جو پھر بھی ناقص رہے بعض کے حصّے پھٹے ہوئے ملے۔ صرف چند دُرست حالت میں تھے مگر اکثر تلف ہو گئے۔ یہ کام ہمارے لیے بہت اجیرن ہو گیا تھا۔ شام کو جب ہم اِس کام سے فارغ ہوتے تو ہماری صورتیں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں بعض تو بالکل بھوت نظر آتے....

غرض ہماری، کتابوں اور کاغذوں کی یہ دُرگت بنی، اِس سے جو رنج اور کوفت ہوئی اُسے کیوں کر بیان کیا جائے۔ اَلفاظ اُس کے بیان سے قاصر ہیں۔ اَیسے مقام پر اُن چیزوں کا کیا رنج کیا جائے، جہاں ہزاروں لاکھوں عزیز جانیں اَیسے ظلم وجبر کا شکار ہو گئی ہوں جو دیدہ نہ شنید، جہاں بے حُرمتی اور بے عزتی کی انتہا ہو گئی ہو، جہاں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے ہوں، جہاں خُون پانی کی طرح بہایا گیا ہو؛

مَیں اور علی شبّر تو مولانا (ابو الکلام) کے ہاں پہلے ہی سے مہمان تھے۔ دو روز کے بعد رفیق الدین احمد بھی آ گئے، اب ہم تین ہو گئے۔ مَیں نے وہاں زیادہ قیام مُناسب نہ سمجھا۔ ایک ہفتے کے بعد ہم نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس میں اُٹھ آئے۔ وہاں گئے ہمیں چار روز ہُوئے تھے کہ معلوم ہُوا حیدر آبادی وفد آ رہا ہے اور اُن کے ساتھ بڑی جماعت ہو گی۔ ہمارے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ ہم نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی مکان مل جائے یا کوئی اور صورت ٹھہرنے کی نکل آئے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ لہٰذا مجبوراً کراچی روانہ ہوئے، جہاں ہم نے اپنے قدیم

کرم فرما اور شفیق آنریبل پیر الٰہی بخش کے ہاں قیام کیا ...... دِلّی کے اِس پندرہ روزہ قیام میں شہر کو زیادہ نہ دیکھ سکے۔ ہماری قسمت میں تو روڑی کی چھانٹن لکھی تھی۔[1]

اُنجمن کی شاخیں سارے مُلک میں تھیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندوستان سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اِس لیے ضرور ہُوا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قائم کیا جائے۔ اِس معاملے میں بڑی بحث رہی کہ یہ مرکز لاہور میں ہو یا کراچی ہی میں رکھا جائے جو مرکزی حکومت کا بھی دارالحکومت ہے۔ اس سے امداد ملنے کی بھی توقع ہے اور سندھ کی حکومت بھی ضرور کچھ نہ کچھ مدد دے گی۔ لاہور میں تو کام کرنے والے بہت تھے، زیادہ ضرورت سندھ، بلوچستان اور سرحد میں کام کرنے کی تھی۔ اَب ہمیں ایسے مکان کی تلاش ہُوئی جو انجمن کی ضروریات کے لیے مُناسب ہو..... اِس کام میں ہمیں سب بڑی مدد اَپنے ہمدرد اور مُخلص دوست پیر سیّد حسام الدین راشدی صاحب سے ملی۔[2]

شاردا مندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا اور اس میں تخمیناً بارہ سو طالب علم تعلیم پاتے تھے انجمن کے لیے اِس سے بہتر عمارت کراچی شہر میں نہیں مل سکتی تھی۔[3]

مَیں دِلّی جانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میرے سب دوست احباب سمجھاتے تھے کہ اب اِس ملک میں اُردو کے کام کے لیے کوئی گنجائش نہیں..... میں اُن سے بحث نہیں کرتا تھا۔ میرا ایک ہی جواب تھا کہ ہندوستان میں ہمارے لاکھوں، کروڑوں بھائی اِس زبان کے بولنے والے ہیں اُن کی خدمت کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے۔

آخر میں نے..... پھر ایک بار دِلّی جانے کا قصد کیا... ۱۳ر جنوری کو علی شبّر نے مجھے

---

[1] [2] [3] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶ (علی الترتیب)

[4] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۰

اور حامد علی صاحب کو زاہد حسین صاحب کے ہمراہ ہوائی جہاز میں سوار کر دیا۔ میں زاہد حسین صاحب کے ہاں مہمان رہا۔ ۔ ۔ انجمن کے مکان میں گیا۔ وہاں ردّیوں کی چھٹائی کا کام جاری تھا جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ اِن ردّیوں کی چھٹائی اور کتب خانے کے مُعائنے کے بعد بہت سی کتابوں اور مسودّوں کے تلف ہونے کا ٹھیک ٹھیک علم ہُوا جب کوئی عزیز کتاب یا مسودہ نہیں ملتا تھا تو اُس کے ضائع ہونے پر دل کو چوٹ سی لگتی تھی؛

دِلّی پہنچنے کے بعد میں دوسرے روز گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا لیکن اُسی روز اُنہوں نے فاقہ شروع کر دیا۔ پانچ روز بعد اُنہوں نے فاقہ توڑ دیا لیکن فوراً ملنا مُناسب خیال نہ کیا کیونکہ اُن پر نقاہت کا اثر تھا ۔ ۔ ۔ میں رفیق صاحب کے ساتھ علی گڑھ چلا گیا اور سفر سے واپسی پر مُلاقات کو مُنحصر رکھا؛

۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو ۶ بجے شام کے میری درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں ہمدردانِ اُردو کا اجتماع ہُوا۔ اِس میں تقریباً پچیس حضرات تشریف لائے۔ اُن میں نواب اسمٰعیل خاں صاحب وائس چانسلر، بیگم اعزاز رسول، شیخ عبداللہ، پروفیسر محمد شریف، پروفیسر منظور حسین آلِ احمد سرور صاحب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، سیّد الطاف علی صاحب، محمد بشیر الدین صاحب لائبریرین، ڈاکٹر ابو اللیث، امیر الدین قدوائی صاحب وغیرہ شریک تھے۔ اِس کا مقصد اِن دو امُور پر غور کرنا تھا: اوّل یہ کہ انجمن ترقیٔ اُردو کا صدر مقام اَب کہاں رکھا جائے۔ دُوسرے موجودہ حالات میں اس کا پروگرام کیا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ؛ اِس[1] اجتماع میں جو صاحب شریک تھے اُن کی گفتگو سے مجھ پر یہ اثر ہُوا کہ یہ لوگ موجودہ حالات کی وجہ سے کچھ سہمے ہوئے سے ہیں اور کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے یا صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے؛

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن صفحہ ۱۹۲

۲۸؍ جنوری کو مَیں الٰہ آباد روانہ ہوگیا۔ ڈاکٹر عبدُالستار صدیقی کے ہاں قیام تھا۔

۳۰؍ جنوری کو مغرب کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میاں زبیر (فرزند ڈاکٹر عبدالستار صدیقی) گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ کسی نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا.... مَیں دوسرے دن دلّی جانے والا تھا اور ارادہ تھا کہ یکم فروری کو گاندھی جی سے مُلاقات کروں گا۔ افسوس دل کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی.... دُوسرے روز دِلّی واپس آگیا۔

دِلّی کے اِس دورانِ قیام میں مکان کی تلاش میں حامد علی صاحب اور مَیں دِلی کے کوچوں کی خاک چھانتے پھرے۔ کوئی مکان ایسا نظر نہ آیا جہاں ہم اپنا دفتر اور کُتب خانہ مُنتقل کر سکیں[1]۔ مجھے کراچی واپس جانا پڑا کہ زاہد حسین صاحب کا دِلّی سے تبادلہ ہوگیا اور میرے قیام کی کوئی صُورت نہ رہی[2]۔

یہاں آتے ہی[3] ہم اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کر دیا۔ ایک کام اِس اثنا میں یہ کیا کہ قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح کو لکھا کہ۔ ہماری تمنّا یہ ہے کہ انجمن کا افتتاح اپنے دستِ مُبارک سے فرمائیں۔ قائدِاعظم نے اپنے جواب میں بڑی مسّرت کا اظہار کیا (۱۶؍ مارچ ۱۹۴۸ء) اور لکھا کہ آج کل بہت مَصروف ہوں۔ سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۵؍ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمن ترقی اُردو پاکستان کا افتتاح کروں گا۔

کراچی میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا مگر میرے دل میں دِلّی کی لو لگی ہوئی تھی اور سوتے جاگتے وہیں کے خواب دیکھتا تھا خاص کر اپنے کُتب خانے کی بربادی کا خیال بہت ستاتا تھا۔ بدقسمتی[4] سے اسی زمانے میں میری طبیعت سخت ناساز ہوگئی...... سب کی یہ رائے قرار پائی کہ تبدیل آب و ہوا کے لیے کوئٹہ چلا جاؤں، جہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے

---

[1] تا [4] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، صفحہ ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۸، ۱۹۹ (علی الترتیب)

بے نظیر ہے۔ چنانچہ میں ۲۲ جولائی کو کوئٹہ روانہ ہو گیا۔ (وہاں) میرے لئے ایک نہایت عظیم الشان چنار کے درخت کے متصل کہ جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا ہے، ایک بڑا ڈیرا لگا دیا (گیا) تھا۔ میں دن بھر اس درخت کے سائے میں بیٹھا کام کرتا رہتا اور اس شاندار درخت کی شوکت و عظمت اور گھنے سائے کا لطف اٹھاتا رہتا......

ابھی[1] مجھے کوئٹہ آئے سولہ سترہ دن ہوئے تھے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبریں پہنچیں کہ اگر میں جلد ہی دلّی نہ پہنچا تو حکومت انجمن کو امداد بھی نہ دے گی (جس کی منظوری ہو چکی ہے) زمین بھی ضبط کر لے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر شخص دلّی سے لائے تھے۔ اس سے مجھے بے حد پریشانی ہوئی۔ دوسرے روز یعنی ۱۰ اگست کو کراچی روانہ ہو گیا.... ہمدرد احباب نے جو اس وقت کے حالات سے زیادہ باخبر تھے، یہ مشورہ دیا کہ پہلے جناب کیفی صاحب کو دلّی بھیجا جائے... وہ دلّی پہنچ کر وہاں کا رنگ دیکھیں اور تمام حالات معلوم کر کے لکھیں، اس کے بعد مجھے دلّی کا قصد کرنا چاہیے۔

۱۱ ستمبر (۱۹۴۸ء) کی شب کو قائد اعظم[2] رحلت فرما گئے۔ اِنا للّٰہ و انا علیہ راجعون۔ پاکستان پر اندھیرا چھا گیا۔ لوگ اس خبر کو سن کر مبہوت رہ گئے (اُن کے دستِ مبارک سے انجمن کے افتتاح کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی) دوسرے دن یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدر آباد پر چڑھ آئی ہے۔ ۱۸ ستمبر کو معلوم ہوا کہ ہندی فوجیں حیدر آباد میں داخل ہو گئیں۔ رُوسیاہی کا وہ داغ جو کبھی بنگال اور دکن کے چہروں پر نمایاں ہوا تھا اُس تاریخ کو حیدر آباد کی پیشانی پر چمکا۔

میں ۳ اکتوبر[3] کو ہوائی جہاز سے دلّی روانہ ہوا.... دلّی پہنچنے[4] کے دو دن بعد یعنی ۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا ابو الکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا، اور حقیقتِ حال بیان کی کہ

---

[1] تا [4] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲ اور ۲۰۳ (علی الترتیب)

انجمن کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا۔ انجمن کے نام سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بہت بدگمانیاں ہیں۔ آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں رہے اور ایک وہاں ــــ میں نے کہا، میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان، ایران، چین، عرب اور انڈونیشیا وغیرہ میں ـــــ رہی بدگمانیاں، تو اُن کے رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے اُس کے لیے پوری آزادی ہو ــ خصوصاً اردو کے لیے جو یہاں کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے ــ کہا: یہ ٹھیک ہے لیکن موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں۔ میں نے کہا آپ تعزیراتِ ہند میں ایک دفعہ کا اضافہ کیوں نہیں کر دیتے کہ ہمیشہ کے لیے جھگڑا ہی ختم ہو جائے ــ جناب کیفی صاحب سے ملا، وہ اِس سے قبل ڈاکٹر تارا چند سے ملے تھے۔ اُنہوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ہم سے بدگمان ہے"۔[1]

اب ہمارا کام فی الحال یہ رہ گیا تھا کہ صبح ناشتے کے بعد کتب خانے جاتے، کتابوں کی ترتیب درست کرتے اور جو خراب اور شکستہ ہو گئی تھیں یا بارش کی وجہ سے جن کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی اُن کو الگ رکھتے جاتے، شام کو قیام گاہ پر واپس آتے۔ میں[2] نے کلکتہ عبدالرحمٰن صدیقی کو خط لکھا اور انجمن پر جو گزر رہی تھی، اُس کی اطلاع دی اور لکھا کہ آپ یہاں آکر ہماری مدد کیجیے، چنانچہ وہ ۱۶ر دسمبر کو دہلی پہنچ گئے اور دوسرے ہی روز سے اپنی مہم شروع کر دی .... مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر بیزار ہو کر ۸ر دسمبر کو بذریعہ ہوائی جہاز بھوپال چلے گئے۔

یہ لکھنا بھول گیا کہ جب تک دلّی رہے، سی آئی ڈی کی ہم پر نگرانی رہی۔ بعض اوقات میرے ملازموں کو ستاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ آج کل کیا کر رہے ہو اور کون کون ملنے آتا ہے

---

[1] [2] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن صفحہ ۲۲۶، ۲۲۷ (علی الترتیب)

......دِلّی میں رہ کر ہم نے سب جتن کر کے دیکھ لیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی! آخر تنگ آکر اِسی میں خیریت دیکھی کہ دلّی کو خیر باد کہہ دیں۔ چُنانچہ ۶ رجنوری ۱۹۴۹ء کو میں گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ہو گیا۔ بھوپال پہنچ کر چند روز آرام کیا اور دِلّی کی کثافت اور کوفت سے نجات پائی ۲۴ رجنوری کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۲۵ کی صُبح کو بمبئی پہنچا۔ دو تین روز قیام کر کے بعض اَحباب سے ملا اور دو ایک کام تھے وُہ کیے آخر ۲۸ رجنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتا ہُوا جہاز میں سوار ہُوا ؎

رُخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بے خزاں
رہ چُکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

یہ جو کہتے ہیں "شاعری جزویست از پیغمبری" کبھی کبھی یہ بات سچ ہوتی ہے۔ حالیؔ نے یہ شعر پچھتر سال پہلے لکھا تھا، اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا!

جہاز ساڑھے بارہ بجے کراچی پہنچا۔ ہوا خانے پر شعیب قریشی صاحب، سیّد ہاشمی صاحب خان عبد الطیف خاں صاحب اور پیر حسام الدین صاحب ملے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ خیر و عافیت سے پاکستان پہنچ گیا۔ اب یہاں نئی مہم کا آغاز ہو گا۔

۷

پاکستان میں ابتدائی بے سروسامانی

۱۹۴۹ء ——— ۱۹۵۴ء

تقسیمِ ہند کے وقت انجمن اور اصحابِ انجمن پر کیا گزری اس کی رُوداد "چراغِ انجمن افروز" کی زبانی پیش کی گئی ہے پیر حسام الدین راشدی کے نام ایک خط میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

دلی کے فسادات میں سب سے زیادہ صدمہ مجھے دو چیزوں کا ہوا، ایک اُردو لغت کے تلف ہونے کا۔ اور دوسرا جو تھوڑا بہت کام اُردو ادب کی تاریخ کا کیا تھا، اُس کے ضائع ہو جانے کا[1]..

گویا عمر بھر کے شوقِ علمی کا کُل سرمایہ آزادیٔ ہند کی نذر ہوا۔ انجمن نے لُٹ پٹ کر پاکستان میں پناہ لی۔ ہجرتِ مکانی میں کس قدر نقصان ہوا، اُس کی طرف مولوی عبدالحق نے ایک جگہ اِن لفظوں میں اشارہ کیا ہے:

"انجمن کا تمام سامان و اسباب تباہ کر دیا گیا۔ کُتب خانے کا بیشتر حصّہ جو بچ رہا تھا اُس کے لانے کی اجازت نہیں ملی۔ کئی لاکھ کی مطبوعات وہیں چھوڑنی پڑیں اور نقدی سرمایہ بھی ضبط ہو گیا[2]۔"

نقد و جنس کا جو زیاں ہوا اُس کا کوئی تخمینہ تو پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن مولانا سید ہاشمی فرید آبادی کے ایک بیان اور اندازے کے مُطابق اواخر ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقیٔ اُردو کے پاس:

"تقریباً دو لاکھ روپیہ نقد اور مطبوعات، کاغذ وغیرہ کوئی تین لاکھ روپے کا مُصدقہ اثاثہ تھا۔ فروختِ کُتب و رسائل سے اس کی آمدنی کم و بیش ۶۵ ہزار اور حیدر آباد کی امداد ملا کر ایک لاکھ روپیہ

---

[1] قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء صفحہ ۳۰۱ [2] خطباتِ عبدالحق، ۵۱۴

سالانہ سے بڑھ جاتی تھی[1]۔"

ختم سال ۱۹۴۶ء میں انجمن کے سرمائے کے اِن اعداد و شُمار سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تقسیم ہند کے وقت انجمن کا نقد و جنس کتنا کچھ رہا ہوگا۔ یہ سب کا سب بحقِ سرکار ضبط ہُوا۔ مولوی عبدالحق کا بیش قیمت ذاتی کُتب خانہ تک حکومت بھارت کے "مُعزّز حُکّام اور مُتوسّلین" کی حرص و ہوس کا لُقمہ بنا، یہاں تک کہ مولوی صاحب کا دوسرا ذاتی سامان بھی سب کا سب لوٹ لیا گیا، موٹر توڑ پھوڑ دی گئی[2]۔ بدقت تمام مولوی عبدُالحق جان سلامت لے کر پاکستان پہنچے۔

کراچی آنے اور انجمن کو یہاں ٹکانے کے باوجود مولوی عبدُالحق بھارت کا مرکز اور محاذ چھوڑ دینے کے حق میں نہیں تھے۔ کوئی ڈیڑھ برس تک وُہ اِسی رائے پر قائم رہے۔ پاکستان میں انجمن کا یہ زمانہ کارگزاری کے اعتبار سے تذبذب اور تعطّل کا زمانہ ہے لیکن بالآخر اُنہیں بھارت کے مرکز اور محاذ سے دست کش ہونے پر مجبور ہونا پڑا اور وُہ اَواخر ۱۹۴۹ء میں صرف پاکستان میں رہ کر کام کرنے کے عزم و ارادے کے ساتھ مُستقلاً بھارت کو خیر باد کہہ آئے اور کراچی کو نیا مستقر بنایا۔

کراچی میں انجمن کا ہفت روزہ ترجمان "قومی زبان" یکم جون ۱۹۴۸ء سے نکلنا شروع ہُوا اور ہر چند اِسی سال انجمن کا نیا آئین بھی مُرتب ہو گیا اور پاکستان میں انجمن ترقیٔ اُردو کی نئے سرے سے رجسٹری بھی کرا لی گئی لیکن صحیح معنوں میں انجمن ۱۹۴۹ء میں مولوی عبدُالحق کے مُستقلاً پاکستان آنے پر ہی مُستقل پاکستانی اِدارہ بنی۔ اِسی سال انجمن کے صدر سر تیج بہادر سپرو کا انتقال ہُوا جسے ہاشمی فرید آبادی کے بقول:

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، ۲۳۲ [2] مکتوبات عبدالحق (مرتبہ جلیل قدوائی)، ۲۳۳

قدرت کی طرف سے بھی ایک اعلان خیال کرنا چاہیے کہ انجمن کا ہندوستان کا دورِ ختم اور نئی مملکت، پاکستان میں عہدِ جدید کا آغاز ہوتا ہے [۱]۔"

پاکستان میں سر شیخ عبدالقادر انجمن کے پہلے صدر منتخب ہوئے لیکن اگلے ہی سال اُن کا انتقال ہو گیا اور انجمن اُن کی سرپرستی سے محروم ہو گئی۔ اس زمانے میں غالباً عارضی طور پر اردو کے دیرینہ خدمت گزار پنڈت دتا تریہ کیفی انجمن کے صدر بنائے گئے۔

۱۹۵۰ء میں مجلسِ نظمار نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو صدر انجمن منتخب کیا۔ مولوی عبدالحق اِس تجویز کے حق میں نہیں تھے لیکن بوجوہ انہیں منصبِ صدارت قبول کرنا پڑا اور پھر تادمِ آخر یہ اعزاز، جس کے وُہ ہر طرح مستحق تھے، اُنہیں نصیب رہا۔

پیرانہ سالی میں شدید صدمے جھیلنے اور وقت کی بیداد کے ہاتھوں گھر سے بے گھر ہونے کے باوصف مولوی عبدالحق نے حواس پر قابو رکھا اور کراچی آکر اطمینان کا سانس لیا خود اُن ہی کے لفظوں میں:

"باوجود بے سروسامانی اور ناداری کے اور باوجود طرح طرح کی مشکلات کے ہم ہمت نہیں ہارے اور کُچھ دنوں کے بعد انجمن نے پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ آپ نے رسالے دوبارہ نکالے۔ (ہفت روزہ) پھر پندرہ روزہ "قومی زبان" ماہانہ "معاشیات" سہ ماہی "اُردو" اور "سائنس" اور ان کے علاوہ ایک نیا سہ ماہی "تاریخ و سیاسیات" بھی ۱۹۵۱ء سے نکلنا شروع ہو گیا۔ علاوہ ان کے (۱۹۵۱ء تک) بیس نئی اعلا پائے کی تصانیف اور چند پُرانی کتابیں شائع کیں۔ اصطلاحات علمیہ کی دو نئی جلدیں، فلکیات اور جغرافیہ پر طبع کیں۔ پاکستان کے مختلف مقامات پر انجمن کی نئی شاخیں قائم کیں۔ متعدد سرکاری اِداروں اور محکموں کی اِصطلاحات کے وضع کرنے میں

---

[۱] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، ۲۲۹

کافی مدد دی لے۔"

غرض پاکستان میں ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ کام کا آغاز ہوا۔ کراچی میں کوئی چاہے تو زندگی کی ہر آسائش کے سامان کیے جا سکتے تھے لیکن کتابیں میسّر نہیں آتی تھیں اچھے کتب خانے بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ علمی و ادبی کام کرنے والوں کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اِس مشکل کو رفع کرنے کے لیے انجمن نے ایک عام کتب خانہ قائم کیا۔ اِبتداً اس کے لیے دس بارہ ہزار کتابیں فراہم ہوئیں۔ اِس کے اِفتتاح کے لیے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان صاحب کو زحمت دی گئی بڑی شان سے جلسہ ہوا۔ دو دو ایڈریس اُن کی خدمت میں پیش کیے گئے، لیکن بابائے اُردو کے لفظوں میں:

"وزیرِ اعظم نے تحسین و تعریف تو ایک طرف ایک لفظ بھی ہمت افزائی کا نہ کہا اور امداد کی درخواست کا جواب اِنکار لے۔"

ظاہر ہے اِس جواب سے انجمن کے جملہ بہی خواہوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ خود اِس پر بابائے اُردو کا ردِ عمل یہ تھا کہ:

"مرکز کا محکمۂ تعلیم ہمارے کاموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا وہ حسد کرتا ہے، خود کچھ کرتا نہیں، دوسرے کرتے ہیں تو اُنہیں کرنے نہیں دیتا سے۔"

چوبیس پچیس سال پہلے جو کتب خانہ اِن ناموافق حالات میں قائم کیا گیا تھا آج کراچی کے عام کتب خانوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے، بلاشبہ یہ اس کے کار پردازوں کے اخلاصِ نیت کا نتیجہ ہے۔ علمی تحقیقات کے لیے بابائے اُردو نے ایک خاص کتب خانہ بھی ترتیب دیا جس

لے خطبات، ۵۱۴ ؎ مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۳۱۸

سے مکتوباتِ عبدالحق صفحہ ۳۱۹

میں بڑی کاوش سے کتب اسناد اور مخطوطات اور علم و فن کی امہات کتب جمع کی گئیں۔
غرض پاکستان میں انجمن آغازِ کار ہی سے اُردو کا "پاور ہاؤس" بن گئی!

ہمہ جہتی علمی و ادبی، اشاعتی و توسیعی کارگزاریوں سے قطع نظر خود بابائے اُردو کے بقول پاکستان میں:

"انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو کالج کا قیام ہے[1]۔"

اِس کالج کے قیام کے سلسلے میں بابائے اُردو مولوی عبدُالحق کی راہ میں بڑے موانعات تھے اس کے الحاق کا مسئلہ طے نہیں ہُوا تھا کہ مولوی عبدُالحق نے "اِس کا انتظار کیے بغیر اللّٰہ کا نام لے کر اُردو کالج جاری کر دیا۔" اُن کا پختہ یقین تھا کہ "اِس کا الحاق ہو کر رہے گا[2]۔" کالج کے سلسلے میں امداد تو بعد کی بات تھی، اس کا الحاق ہی مسئلہ بن گیا۔ ڈاکٹر محمد داؤد رہبر کے نام ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء کے ایک خط میں بابائے اُردو لکھتے ہیں:

"پہلے ہی پریشانیاں کیا کم تھیں۔ یہ کالج قائم کر کے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی اور مول لے لی۔ کوئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں سندھ یونیورسٹی نے انکار کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی حدودِ اَرضی سے باہر ہے۔ اَب میں اِس سوچ میں ہُوں کہ کروں تو کیا کروں[3]۔"

مختصر یہ کہ مولوی عبدُالحق کو اُردو کالج کے قیام اور اس کے الحاق میں بہت مشکل پیش آئی اور مولوی صاحب ہی کے لفظوں میں:

"اِس مشکل کا باعث یہ تھا کہ کالج کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ گویا قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا

---

[1] خطبات، ۵۱۵ [2] مکتوباتِ عبدالحق، ۵۱۵

[3] مکتوباتِ عبدالحق، ۲۱۹

یونیورسٹی کی نظر میں ایک مجرمانہ فعل تھا۔ ایک سال کی جد و جہد اور لڑائی کے بعد الحاق کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ بھی اُس وقت جب مُخالف حضرات کی کمیٹی نے ٹھوک بجا کر دیکھ لیا کہ تعلیم کیسی ہے، اَساتذہ کس قابلیت کے ہیں۔ کتب خانہ کیسا ہے، جگہ کافی ہے یا نہیں، کتابیں جو پڑھائی جاتی ہیں وہ یونیورسٹی کے معیار کی ہیں یا نہیں، فنڈ کتنا ہے، فیسیں وصول ہوتی ہیں یا نہیں، رجسٹر باقاعدہ ہیں یا نہیں، جب کوئی رخنہ نہ ملا تو کمیٹی نے الحاق کی سفارش کی۔ اِس میں بھی کئی پخیں لگا دیں یعنی ایم۔ اے کی تعلیم نہ دی جائے۔ جغرافیہ اور تجارت نہ پڑھائی جائے، مگر ہم نے ایم۔ اے بھی رکھا، جغرافیہ بھی پڑھایا، تجارت بھی پڑھائی، یعنی کردم و شُد۔ جب اِن شُعبوں کی تعلیم ہوتی ہی رہی تو یونیورسٹی کو بھی ماننا ہی پڑا[1]۔"

> "لوگ مجھے لڑاکا کہتے ہیں۔ مَیں طبعاً لڑاکا نہیں، حالات نے مجھے ایسا بنا دیا، وہاں غیروں سے لڑتا رہا یہاں اَپنوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ ہماری عُمر یونہی لڑتے بھڑتے گزر رہی ہے[2]۔"

اُردو کالج نے ۲۵۔ جون ۱۹۴۹ء سے باقاعدہ کام شروع کیا[3]۔ گو کالج اس سے بھی کوئی ایک سال پہلے سے قائم تھا لیکن اِبتداً پنجاب کے امتحان ادیب، اَدیب عالم اور ادیب فاضل کے لیے طلبہ کو تیار کیا جاتا تھا اور صرف انہیں درجوں کی جماعتیں تھیں لیکن ۱۹۵۱ء میں اِس کالج میں ایم۔ اے، پی ایچ ڈی تک تعلیم ہونے لگی اور ذریعہ تعلیم ہر سَطح پر اُردو ہی رہا[4]۔

مولوی محمد عبدُ الغنی خاں نیازی اُردو کالج کے پہلے پرنسپل مُقرر ہوئے[5]۔ وہ

---

[1] خُطبات، ۵۱۶ [2] مکتوباتِ عبدالحق، ۲۲۴
[3] قومی زبان کراچی، ۱۶۔ اپریل ۱۹۵۱ء [4] خُطبات، ۵۱۶
[5] قومی زبان کراچی، ۱۶۔ دسمبر ۱۹۵۰ء

مورس کالج ناگپور میں پروفیسر رہ چکے تھے اور تعلیم و تدریس کا بڑا اچھا تجربہ رکھتے تھے۔ کالج میں پہلے سال ۲۶۹ طلبہ نے داخلہ لیا تھا[1]، اور باقاعدہ تدریس کا کام شروع ہُوا تو صرف فرسٹ ایئر (انٹرمیڈیٹ) اور تھرڈ ایئر (بی۔اے) کی جماعتیں کھولی گئی تھیں[2] تاکہ یہ ایک سال اُردو کے ذریعے پڑھ لیں تو سیکنڈ ایئر اور فورتھ ایئر کے قابل ہو جائیں[3]۔

پاکستان میں آکر مولوی عبدالحق نے اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی تحریک کا آغاز کیا اِس سلسلے کا بنیادی کام انجام دینے کی خدمت اُنہیں کے سر آئی۔ ۲۵۔جون ۱۹۵۰ء کے ایک خط میں مولانا غلام رسول صاحب مہر کو لکھتے ہیں:

"جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے کام کا ہجوم بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اَب جو مَیں نے حکومت کے دفتروں کو جھنجھوڑنا شروع کیا تو وُہ اپنے اپنے دفتر کے اَلفاظ اور اصطلاحات ترجمے کے لیے میرے پاس بھیج رہے ہیں۔ مَیں نے حکومت سے کچھ رقمی اِمداد طلب کی ہے تاکہ

---

[1] قومی زبان کراچی بابت ۱۶۔اپریل ۱۹۵۱ء [2] مکتوبات ۱۴۱/۳ [3] آج اُردو کالج میں طلبہ و طالبات کی تعداد کسی طرح ڈیڑھ دو ہزار سے کم نہیں ہو گی۔ یہاں فنون، سائنس، تجارت اُور قانون سَب شعبوں میں یونیورسٹی کے تمام مضامین کی تعلیم اُردو کے ذریعے دی جاتی ہے۔ اُردو کالج میں اَساتذہ کی جیسی منتخب جماعت برسرِکار ہے، تعلیم و تدریس کا یہاں جو معیار رہے اُور علمی و تہذیبی اَقدار کا اِس ادارے میں جو پاس اور لحاظ ہے اُس کے پیشِ نظر تنہا کراچی میں نہیں پاکستان بھر کے تعلیمی اِداروں میں اِس کالج کا نام اور مقام بہت اُونچا ہے۔ یہ سَب مولوی عبدُالحق کے اَخلاصِ نیت اُور ایثار و اخلاق کا ثمر ہے۔ بلاشُبہ یہ کالج مولوی عبدُالحق کی ایک زندہ اور قابلِ فخر یادگار ہے۔

تمام دفاتر اور عدالتی الفاظ و اصطلاحات کی ڈکشنری تیار کردوں علمی اصطلاحات جو اس وقت تک بن چکی ہیں، وہ سب جمع کر رہا ہوں ۔ انجمن اور کالج کا کام اس سے الگ ہے، دعا کیجیے کہ یہ بیڑا ساحل مراد تک سلامتی سے پہنچ جائے[1]۔"

پاکستان میں آکر مولوی عبدالحق نے "قاموس الکتب" کے ایک پرانے منصوبے پر انجمن میں کام شروع کرایا ۔ اس منصوبے کی طرف مولوی عبدالحق کو اول اول ۱۹۴۲ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے متوجہ کیا تھا ۔ مولانا ماجد دریابادی کے گرامی نامے کے جواب میں مولوی عبدالحق ۳۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"عام انسائیکلوپیڈیا کا خیال تو مجھے ضرور تھا لیکن قاموس ادب اردو کا کبھی خیال نہ آیا ۔ آپ کی یہ تجویز نہایت مناسب ہے، اس کے متعلق آپ سے اور دیگر اصحاب سے مشورہ کروں گا ۔ بلاشبہ یہ کام کرنے کے قابل ہے[2]۔"

۳ ۔ فروری ۱۹۴۳ء کے ایک دوسرے خط میں مولانا عبدالماجد دریا بادی ہی کو لکھتے ہیں :

"قاموس ادب اردو کو میں بھولا نہیں ہوں ...... کمیٹی میں میں آپ کی تجویز پیش کروں گا[3]۔"

اگلے چند برسوں میں بوجوہ مولوی عبدالحق قاموس کے منصوبے پر کام شروع نہیں کر سکے ۔ تقسیم کے بعد مولوی صاحب اس طرف متوجہ ہوئے ۳ ۔ اپریل ۱۹۴۸ء کے ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو یہ نوید دیتے ہیں :

---

[1] مکتوبات عبدالحق، ۲۲۵ [2] مکتوبات عبدالحق، ۲۰۸

[3] مکتوبات عبدالحق، ۲۱۰

"اب ہم نے اپنے پروگرام کا نیا خاکہ تیار کیا ہے۔ آپ کی تجویز...... میرے پیشِ نظر ہے۔ اِنشاء اللہ سب سے پہلے اِسی کام کا آغاز ہوگا[1]"

۱۹۵۵ء میں جا کر کہیں قاموس کا کام شروع ہو سکا لیکن اِس سلسلے میں جو لطیفہ پیش آیا وُہ خوب ہے۔ یہاں ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام ۸ جولائی ۱۹۵۶ء کے ایک خط کا اقتباس بے محل نہ ہوگا، مولوی عبدُالحق لکھتے ہیں :

"ہمارے تعلیم یافتہ عربی فارسی کتابوں کو مُطلق قابلِ التفات نہیں سمجھتے، ہاں اگر کوئی یورپین یا امریکی کسی کتاب یا ہمارے کسی قدیم نظریے کے مُتعلق کوئی تعریفی کلمہ کہہ دے تو وُہ ان کے لیے وحی والہام ہو جاتا ہے —— ایسا ہی ایک واقعہ اِس سال انجمن کو پیش آیا۔ انجمن میں ایک جامع فہرست اُردو کُتب (مطبوعہ، غیر مطبوعہ) کی پچھلے سال سے تیار ہو رہی ہے۔ گزشتہ سال وزارتِ تعلیم کو امداد کے لیے لکھا کوئی توجّہ نہ کی۔ خُدا کا کرنا یونیسکو نے حکومت سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنی زبان کی کوئی ببلوگرافی ہے اور اگر نہیں تو کیا وُہ تیار ہو سکتی ہے اور شائع ہو سکتی ہے — اب وزارتِ تعلیم والے بھاگے ہُوئے ہمارے پاس آئے اور امداد دینے پر آمادہ ہو گئے اور رقم دے دی۔ یہ حال ہے ہمارے اہلِ حکومت اور قدر دانانِ علم وادب کا[2]"

اُردو کے لیے مولوی عبدُالحق نے ہمیشہ جہاد کیا۔ اِس کے لیے لڑنے میں اُنہوں نے نہ اپنوں اور غیروں کی پروا کی، نہ کبھی اپنے آرام اور آسائش پر نظر رکھی۔ پاکستان میں بھی اُردو کے لیے ہر محاذ پر وہ سینہ سپر رہے۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام یکم فروری ۱۹۵۵ء کے ایک خط کا فقرے

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، ۲۱۹
[2] مکتوباتِ عبدالحق، ۳۲۸

طویل اقتباس دیکھیے :

" پچھلے سال جس روز مجلس دستور ساز (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا، مَیں ایک لاکھ اشخاص کا جلوس لے کر مئی کی گرمی میں تین میل پیدل چل کر ایوانِ اسمبلی میں پہنچا...... پولیس اور مسلّح فوج مشین گنیں اور ٹینک لیے کھڑی تھی کہ ذرا بھی جنبش ہو تو فائر کر دیں۔ سارے شہر میں کامل ہڑتال تھی۔ عاملانِ حکومت کا خیال تھا کہ خون خرابہ ہوگا لیکن یہ ایسا پُر اُمن احتجاج تھا کہ سب حیرت میں رہ گئے۔ اسمبلی کا اجلاس برخاست کرنا پڑا اور دوسرا دن مجھ سے بات چیت کا ٹھہرا۔ گفتگو ہوئی سمجھوتا بھی ہوا لیکن عمل اس کے خلاف کیا۔ جب اِس کا کچھ اثر نہ ہوا تو میری چند تحریروں کا کیا اثر ہوگا، بہرحال کوئی سُنے یا نہ سُنے، میں لکھتا رہوں گا۔

جن صاحبوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے اُن کو زبان، اَدب، علم و تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ مملکتِ پاکستان کے وزیرِاعظم........ صاحب بنائے گئے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مجھے یہاں کا چیف انجینئر بنا دیا جائے۔

ہمارے گورنر جنرل غلام محمّد صاحب بھارت کے سفر سے بہت خوش آئے ہیں۔ بہت پُرجوش استقبال ہوا۔ اکیس توپوں کی سلامی دی گئی، دعوتیں کھائیں، گلے ملے اور سمجھے کہ سب تنازعات کا فیصلہ ہوگیا۔ یہ اپنے نفس کو اور دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ ایسے خوش آئے کہ گویا دلّی فتح کر آئے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کا کوئی تنازعہ نہیں سوا کشمیر کے۔ اس کا

ملنا فوج کی کمی بیشی پر نہیں بلکہ اُخلاقی حالت پر ہے۔ اگر ہم میں قومی حمیت ہمت و استقلال، ایثار اور جذبۂ اجتہاد ہو تو کشمیر آج مل سکتا ہے۔ اخلاقی حالت مفقود ہے اس لیے اپنے عیب اور کمزوری چھپانے کو ایسی حرکتیں کرتے ہیں وقت گزرتا جاتا ہے۔ جوش دھیما ہوتا جاتا ہے۔ ایک روز صبر کر کے بیٹھ رہیں گے[1]۔"

مولوی عبدالحق کے اِس خط کا ایک ایک حرف اُن کے دلِ دردمند کی آواز ہے اور ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے — ۱۹۵۲ء میں مولوی صاحب کی گورنر وقت سے ایک ڈرامائی ملاقات ہوئی اس کی تفصیل ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے نام ایک خط میں اِس طرح ملتی ہے:

"مَیں نے غلام محمدؐ صاحب سے ملنے کی کوشش کی اور نہ ایسا اِرادہ تھا لیکن عجیب اِتفاق ہُوا — مَیں حسبِ معمول شام کو ٹہلنے کے لیے نکلتا تھا۔ ایک دن سڑک کے کنارے پیدل پٹڑی پر جا رہا تھا۔ ادھر سے گورنر جنرل بہادر کی سواری آگے پیچھے کئی جیپوں کے درمیان سڑک سے نکلی اور یکایک رُک گئی اور گورنر جنرل اپنی کار میں سے اُتر کر مجھے سڑک پر سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اُنہوں نے رستے میں خود ہی انجمن کا ذکر چھیڑا اور کہا اُردو کے بنیادی اور بڑے کام بغیر حکومت کی امداد کے نہیں ہو سکتے۔ مَیں فضل الرحمٰن کو بُلا کر اس کے متعلق کہوں گا اور بہت کچھ قُم قُم کرتے رہے۔ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ دو روز بعد لنچ پر بُلایا۔ اس لنچ میں نشتر صاحب بھی تھے۔ دیر تک نہایت بے تکلفی سے باتیں ہوتی رہیں اور انجمن کا بھی ذکر آیا[2]۔"

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، ۳۳۵ [2] مکتوباتِ عبدالحق، ۵۲۳

اِس سے قبل ۱۹۵۱ء میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے اُردو کی لائقِ توصیف خدمت کے صلے میں مولوی عبدُالحق کی پانسو روپیہ ماہانہ پنشن منظور ہو چکی تھی۔ اس کے بارے میں حکیم امامی صاحب کو ۱۰۔ مئی ۱۹۵۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" پاکستان کے وزیرِ تعلیم بنگالی ہیں اور اُردو نہیں جانتے مگر اُردو کے سب سے زیادہ حامی یہی ہیں۔ اُنہوں نے انجمن اور کالج کے معاملے میں ہماری بڑی مدد کی۔ اُنہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ میری حالت سقیم ہے اَور میں اَب نادار ہو گیا ہُوں۔ حکومت میں تحریک کر کے پنشن کرائی ہے اور مجھ سے بہت معافی مانگی کہ میری اجازت بغیر اُنہوں نے ایسا کام کیا اور ایک ہمدردانہ خط لکھا ہے۔ مَیں نے اَب تک رقم نہیں اُٹھائی۔ مجھے شرم معلوم ہوتی ہے۔ یہاں پاکستان کی خدمت کے لیے آیا تھا۔ میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ مَیں اس پر بار ہُوں۔ اُس طرف سے کئی بار تقاضا ہو چُکا ہے کہ رقم اُٹھالی جائے۔ اِنکار بھی نہیں کر سکتا اور کروں تو کس برتے پر، تقدیر کا لکھا پُورا ہوتا ہے۔ یہ دن بھی دیکھنے تھے [1] "

اِس زمانے میں مَولوی صاحب خاصے تہی مایہ ، انجمن کی طرف سے خاصے مُتردّد اَور خود اَپنے آپ سے قدرے بیزار اور بُددل تھے۔ پیر حسام الدین راشدی کے نام، مَولوی عبدُالحق کے خطوں سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ ۱۸۔ فروری ۱۹۵۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"انجمن . . . . . کی جان کے لالے پڑے ہُوئے ہیں . . . انجمن ہی بچ جائے تو غنیمت جانیے [2] "

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، ۲۰۵ [2] قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء، صفحہ ۳۰۱

چار دن کے بعد پیر صاحب ہی کو خبر دیتے ہیں کہ انجمن کا بیمار :

"کوئی دن کا مہمان معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس کے کفن و دفن کی فکر ہے۔
افسوس، کہ اب اتنی استطاعت بھی نہیں کہ اس کی شان کے مطابق، اس
کا جنازہ اٹھائیں اور سپردِ خاک کریں[۱]"

۹- مئی ۱۹۵۲ء کے ایک خط میں پیر صاحب کو اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"میری حالت اب یہ ہے :

تدبیرِ وصال کر رہا ہوں — تقدیر سے چال کر رہا ہوں
کچھ حالتِ دردِ دل نہ پوچھ — جیتا ہوں کمال کر رہا ہوں

خدا آپ کو خوش رکھے آپ کبھی کبھار پوچھ تو لیتے ہیں، ورنہ یہاں تو کوئی
اتنا بھی نہیں[۲]"

اس سے قبل بابائے اردو کے ۶- مارچ ۱۹۵۲ء کے ایک خط بنام پیر حسام الدین راشدی
کے مطابق، انجمن اور اصحابِ انجمن پر یہ وقت گزر چکا تھا کہ انجمن کی مالی حالت از حد خراب
ہو گئی اور وزارتِ تعلیم نے کچھ توجہ نہ کی تو مولوی عبدالحق کو مجبوراً کارکنانِ انجمن کو ایک مہینے کا نوٹس
دے دینا پڑا، لیکن اُن کا عزم پھر بھی جوان تھا اور وہ نا امید نہیں ہوئے تھے :

جب بار بار یاد دلانے، لکھنے، کہنے پر وزارتِ تعلیم نے کچھ توجہ نہ کی اور ایسے
گیارہ مہینے گزر گئے اور انجمن کی مالی حالت از حد خراب ہو گئی تو مجبوراً میں
نے کارکنانِ انجمن کو ایک مہینے کا نوٹس دے دیا۔ نوٹس کا دینا تھا کہ وزارتِ تعلیم

۱۔ قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء، صفحہ ۳۰۱

۲۔ قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء، صفحہ ۳۰۴

اور وزارتِ فنانس غفلت سے چونکے اور کہا کہ ہم نے گرانٹ منظور کرلی ہے'' پرسوں اپنا آدمی بھیجیے اور چیک منگا لیجیے۔ معلوم ہُوا کہ صرف پندرہ ہزار روپے منظور کیے ہیں۔ مَیں نے یہ معاملہ مالی کمیٹی کے سامنے پیش کیا اور یہ کہا کہ ہم یہ گرانٹ منظور نہیں کریں گے۔ اس سے زیادہ کی تو انجمن مقروض ہے۔ اِس پر دیر تک بحث ہُوئی۔ آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ جب تک حکومت انجمن کی مختلف علمی سرگرمیوں کے لیے الگ الگ امداد منظور نہ کرے اُس وقت تک یہ رقم قبول نہ کی جائے۔ وزارت نے پریس نوٹ شائع کیا جس میں اپنی بریت ثابت کی۔ اس پر میں نے اپنا بیان دیا جو آج اخباروں میں شائع ہوگیا ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں مَیں پندرہ ہزار کبھی قبول نہ کروں گا اور حکومت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ اِنشاءاللہ ہمیں، اِس سے زیادہ ملے گا اور بہت ملے گا۔ مَیں اپنی اسکیم تیار کر رہا ہوں[1]۔''

---

[1] قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۶۴ء ص ۳۰۲

۸

مردم گزیدہ مولوی عبدالحق

۱۹۵۵ء ——— ۱۹۵۸ء

"بابائے اُردو مولوی عبدُالحق کو پاکستان میں انجمن کے کام کو جمانے میں بہت محنت کرنا پڑی اُن کے پیہم خلوص اور ایثار کے ہاتھوں بالآخر کام چل نکلا۔ سات آٹھ برس تک انجمن بڑی خوش اُسلوبی سے اُردو زبان و اَدب کی خدمت کرتی رہی اور اس دوران میں علی الترتیب ڈاکٹر مُعین الحق، ڈاکٹر محمود حُسین اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحبان انجمن کی مُعتمدی کے فرائض اَنجام دیتے رہے یہ سات آٹھ برس تک قابلِ قدر کام کرتے رہنے کے بعد اَیسے اَفسوس ناک حالات پیدا ہوئے کہ انجمن ایک بے جان ادارہ بن کر رہ گئی۔ مولوی عبدُالحق کے خطوں سے اس دور کے سارے حالات سلسلہ وار مُرتب کیے جا سکتے ہیں:

"میری کشتی عُمر اب کنارے آلگی ہے جو چاہتا تھا نہ ہو سکا۔ حالات سے مجبور ہو گیا اور بُرا بھلا جو کچھ کیا تھا اُس پر پانی پھر گیا۔ اَب بھی ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں لیکن زمانہ روز بروز ناساز گار ہوتا جاتا ہے، کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے۔ ساتھی ہوا کا رُخ دیکھتے ہیں اور ساتھ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ بے وفائی اور غدّاری آج کل کے "شرفا" کا معمول ہو گیا ہے [1]۔"

(بنام ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۱۸ ستمبر ۱۹۵۴ء)

"پاکستان آنے کے بعد قلب ماہیت ہو گئی ہے۔ اَچھے گھرانے کے شریف لوگ اَب یہاں اَیسی کمینہ اور رذیل حرکتیں کرنے لگے ہیں کہ دیکھ کر حیرت اَور شرم

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، ۴۰۰

معلوم ہوتی ہے[۱]۔"

(بنام: ڈاکٹر رُکنُ الدین قُریشی، ۴۔ اگست ۱۹۵۴ء)

"مَیں نے یہاں آکر پانچ رسالے جاری کیے تھے۔ اَب ان میں سے تین (معاشیات سائنس، تاریخ و سیاسیات) بند کرنے پڑے۔ ایک تو ہمارے قدیم کرم فرما ھم سے چھُوٹ گئے اَور نئے لکھنے والے ملے نہیں۔ دوسرے خریدار بہت کم تھے جس سے خسارہ اِس قدر ہونے لگا کہ انجمن برداشت نہ کر سکی، ناچار بند کرنے پڑے اَب دو باقی رہ گئے ہیں، ایک "قومی زبان" دُوسرا "اُردو"۔ ڈر ہے کہیں "اُردو" بھی بند نہ ہو جائے[۲]۔"

(بنام: ڈاکٹر داؤد رہبر، ۳۰ ستمبر ۱۹۵۶ء)

"اُردو" اور "قومی زبان" رہ گئے ہیں۔ یہ بھی سسک رہے ہیں "اُردو" پرانا رفیق ہے۔ خدانخواستہ اگر اسے بند کرنا پڑا تو اِس کا صدمہ شاید مَیں برداشت نہ کر سکوں[۳]۔"

(بنام: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۱۸ ستمبر ۱۹۵۵ء)

"انجمن کے حالات کچھ اِس درجہ درھم برہم ہو گئے ہیں جس کی توقع نہ تھی مَیں نے اِس خیال سے کہ روزمرہ کے انتظامی جھگڑوں، حسابات اور پریس وغیرہ کی نگرانی سے مجھے نجات مل جائے اور مَیں ایک دو اَدبی کام جو اُدھورے پڑے ہیں پُورے کر سکوں جدید سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری کا اِنتخاب کرایا۔ نئے خازن کا

---

[۱] مکتوباتِ عبدالحق، ۶۲۲ [۲] مکتوباتِ عبدالحق، ۱۴۱ ۳

[۳] مکتوباتِ عبدالحق، ۱۰۰

بھی انتخاب ہُوا۔ مَیں سمجھا کہ اَب کام اطمینان سے چلنے گا اور مجھے بھی فرصت مل جائے گی مگر معاملہ برعکس نکلا۔ اِن صاحبوں نے غلط پروپیگنڈا اور سازش سے مجلسِ نظما میں اپنی اکثریت بنالی اور تخریبی کارروائیاں شروع کردیں، چوں کہ سب اختیار اُن کو حاصل ہوچکے تھے اُلٹی سیدھی جو چاہتے ہیں کرتے ہیں نتیجہ یہ ہُوا کہ پریس کی حالت اَبتر ہوگئی . . . ملازموں کو تنخواہ نہیں ملی۔ اِس سال میں کوئی کتاب نہیں چھپی۔ حالانکہ کئی قابلِ قدر کتابیں تیار رکھی ہیں اور بعض کی مکمل کاپیاں بھی لکھی جاچکی ہیں . . . . . یہ طویل داستان ہے . . . . . مَیں نے کچھ دن انتظار کیا کہ معاملہ رُوبراہ ہوجائے تو کام حسبِ معمول شروع کردیا جائے لیکن ابھی تک کوئی صورت نہیں نکلی اور معاملہ عدالت تک جاپہنچا[1]"

(بنام ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۱۰ اگست ۱۹۵۷ء)

"انجمن کی حالت تباہ ہے۔ چند نااہل خودغرض لوگوں نے میرے کُتب خانے اور انجمن پر قبضہ کرلیا ہے۔ علمی و ادبی کام مُعطّل ہے۔ پارٹی بازی اور سازش کا بازار گرم ہے مَیں بے بس اور لاچار اُوپر کی منزل پر بیٹھا رہتا ہُوں ایسی حالت میں مجھے کسی خطاب یا اعزاز سے کیا خُوشی ہوسکتی ہے . . . میرے پاس علم و ادب، اِصطلاحات و لُغات کا ڈھیر رکھا ہے لیکن اشاعت کے لیے روپیہ نہیں اور اَب انجمن پر ایسے لوگوں کا قبضہ ہوگیا ہے جنہیں علم و ادب سے کوئی واسطہ نہیں[2]"

(بنام آمنہ مُمتاز، ۲۹ - مارچ ۱۹۵۸ء)

"مجھے اِس زمانے میں جو تکلیف اور رُوحانی کوفت ہوئی، وہ بیان نہیں

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، ۴۰۱ [2] مکتوباتِ عبدالحق، ۵۶۵

کر سکتا۔ ہماری قوم ایک عجیب قوم ہے اس میں وہ تمام عیوب موجود ہیں جو ایک پس ماندہ اور زوال آمادہ قوم میں ہوتے ہیں۔ ہمارے بھائی اپنے کسی بھائی کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے اور جو علی الرغم ان کے آگے بڑھ گیا ہے، اُسے گرانے اور رُسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں[1]۔"

(بنام: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۱۹۵۷ء)

"میرے قدیم ساتھی اور رفیق ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے اور مَیں اکیلا اُن کا ماتم کرنے اور پاکستان میں ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گیا ہوں.... حریفوں کے دماغ تخریبی جدت سے مالا مال ہیں..... اُنہوں نے مجھے اذیت پہنچانے اور رُسوا کرنے اور انجمن کی تباہی اور بدنامی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ یہ لوگ صاحبِ اقتدار بھی ہیں اور صاحبِ ثروت بھی ایک شیطانی لشکر اُن کے ساتھ ہے جس کا شغل پروپیگنڈہ ہے۔ اِس کام پر بے دریغ روپیہ صَرف کرتے ہیں۔ یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ اُس تعلیمی اِدارے (اُردو کالج) سے جو مَیں نے بڑے شوق سے قائم کیا تھا۔ جب اُسے لوٹ لوٹ کر کھوکھ کر دیا تو اب آپس میں پتی ڈال کر ہزاروں روپیہ رشوت میں اُن عمّال کو دیتے ہیں جو رعایا کے مُحافظ سمجھے جاتے ہیں تاکہ وُہ ہم پر الزامات قائم کر کے ہمیں بدنام کریں۔ کہتے ہیں نئی حکومت میں رشوت بند ہو گئی ہے، اس میں کچھ صداقت ضرور ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اب رشوت کا نرخ بھی بڑھ گیا ہے۔ جہاں سو میں کام نکل جاتا تھا وہاں اب ہزار صَرف کرنے پڑتے ہیں۔

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، ۴۰۲

اَب جو باوجود تمام شرارتوں، پروپیگنڈے اور رشوت کے اُنھیں اپنی مہم کچھ ناکام سی نظر آنے لگی ہے تو اُنھوں نے مصالحت کے نام سے ایک نیا شوشہ چھوڑا ہے۔ ---- مَیں نے بار بار انجمن، کالج اور پریس پر تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کی تجویز کی مگر وہ کبھی اس طرف مائل نہیں ہوتے۔ وُہ جانتے ہیں کہ اگر تحقیقات ہُوئی تو ان بدکاروں کی بداعمالیاں آشکارا ہو کر رہیں گی اور یہ اُنھیں منظور نہیں اس لیے مصالحت..... اور اسی قسم کی مُبہم بے معنی تجویزیں پیش کر دیتے ہیں۔۔۔

یہ خط مَیں نے تلافیٔ مافات کے خیال سے اٹکل سے گھسیٹ کر لکھا ہے اگر اس میں کوئی بے ربطی یا غلطی نظر آئے تو یہ سمجھ کر معاف کر دینا کہ یہ ایک اَیسے مظلوم شخص کی تحریر ہے جس نے کام کو ایمان سمجھ کر کیا پر اَفسوس کہ اَب کام رہا اور نہ ایمان رہا:

عیب نکلا جو ہُنر پیدا کیا
ہم نے کھویا جس قدر پیدا کیا[۵]"

(بنام: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ۲۳ ستمبر ۱۹۵۸ء)

" سالہا سال کی محنت دلّی میں آزادی کی نذر ہو گئی تھی۔ اس کا صدمہ ایسا تھا کہ نہ بُھلا سکا۔ جب یہاں قدم اچھی طرح جم گئے تو مَیں نے پھر کام شروع کر دیا۔ تنہا تھا کوئی مددگار نہ تھا، اپنی مقدرت نہ تھی کہ مدد کے لیے کسی کو مُلازم رکھ لیتا۔ انجمن کی مالی حالت بھی سقیم تھی کئی سال تک دن رات کام کرتا رہا۔ اَب (لُغت کے اَجزا) مُکمل کیے جو تخمیناً دو ہزار صفحات پر ہیں۔ میرے رُفقائے کار نے مجھے

۵ مکتوباتِ عبدالحق، ۴۰۲

ایسی اذیتیں پہنچائیں اور انجمن کو ایسے نقصانات پہنچائے کہ میں کسی کام کا نہ رہا۔ میرا کتب خانہ تک سر بمہر کر دیا۔ میرے مسودات سب کتب خانے میں بند رہ گئے۔ سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ خیانت اور بد دیانتی پر پردہ ڈالنے کے لیے طرح طرح کی اُلجھنیں پیدا کر دیں۔[۱]

(بنام: مولانا عبدالماجد دریا بادی، ۱۹۔ فروری ۱۹۵۹ء)

"(ادارہ انجمن ترقی اُردو) ایک بیج تھا جو اُڑتا اُڑتا اورنگ آباد کی زرخیز زمین میں آ پڑا تھا چند ہی روز میں یہاں کی خوش آب و ہوا کی بدولت اس میں کھنگر پھوٹے، کونپلیں نکلیں اور ہوتے ہوتے یہ خوش نما پودا ایک تناور درخت ہو گیا اور اس نے وہ نشاط انگیز بہاریں دیکھی ہیں جو کم اداروں کو نصیب ہوتی ہیں۔ بہار کے بعد خزاں کا آنا لازم ہے۔ اب وہ خزاں کی بہار دیکھ رہا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی یہ ساری منزلیں طے کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ انسان مر جاتا ہے اس کے اعمال باقی رہ جاتے ہیں۔ افراد مر جاتے ہیں لیکن تحریکوں کو نہیں مرنا چاہیے اُن کی موت قوم کی موت ہے۔[۲]"

(بنام: مولوی غلام ربانی، ۱۱ نومبر ۱۹۵۸ء)

"انجمن کی حالت گزشتہ دو سال سے ابتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اب خرابی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔۔۔۔۔ یہ ایسے نااہل، تخریب پسند، غدار اشخاص کے ہاتھ میں آ گئی ہے جو علم و ادب سے بے بہرہ ہیں۔ سارا روپیہ برباد کر دیا اور اصل کام صفر ہے۔ یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی انشاء اللہ جلد کوئی صورت

---

[۱] مکتوباتِ عبدالحق، ۲۲۹ [۲] رسالہ نورسس، کراچی، جولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۶۱

اِصلاح کی شکل آئے گی[1]۔"

(بنام: ڈاکٹر قطب النسا ہاشمی، ۱۵ جولائی ۱۹۵۹ء)

مکاتیب عبدالحق کی اِن شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں چند سال کا ابتدائی عرصہ انجمن اور مولوی عبدالحق پر بڑا سخت گزرا۔ اس زمانے میں انجمن کی حیثیت عضوِ معطّل کی سی تھی اور خود مولوی عبدالحق گویا بے دست وپا ہو کر رہ گئے تھے۔ بایں ہمہ انجمن کی ابتری اور خرابی کے انتہا پر پہنچ جانے کے باوجود مولوی صاحب مایوس و نااُمید نہیں تھے۔ اللہ کی ذات پر اُنہیں بھروسہ اور صُورتِ اَحوال کی اِصلاح کا یقین تھا۔ اُن سے زیادہ دیر تک اَپنے زندگی بھر کے کام کی یہ تباہی و بربادی نہ دیکھی گئی اُنہوں نے صدرِ مملکت کو انجمن کے حالات کی ایک مُفصّل رُوداد بھیجی اور مُشفق خواجہ مُدیر "قومی زبان" کے لفظوں میں:

"انجمن کے صدر کی حیثیت سے صدر مملکت سے درخواست کی کہ وہ اِس عظیم قومی ادارے کو تباہی سے بچائیں۔ صدرِ مملکت نے جو انجمن ترقیٔ اُردو کی اہمیت و افادیت سے پُوری طرح واقف ہیں، معاملات کی چھان بین کی اور بابائے اُردو کی شکایات کو دُرست پایا۔ اُنہوں نے مارشل لار کا ضابطہ نمبر ۲۱ جاری فرمایا جس کی رُو سے انجمن اور اُس کے ملحقہ اِداروں کی مجلس نظما توڑ دی گئی اور انجمن کو حلقہ الف کے مارشل لار کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ انجمن کے انتظامات کے لیے صدر مُحترم نے ایک مجلسِ انتظامیہ بھی نامزد فرما دی جس کے سربراہ بابائے اُردو مرحوم تھے۔ اِس مجلسِ انتظامیہ نے شب و روز کی محنت سے

---

[1] مکتوبات عبدالحق، ۵۴۵

تمام معاملات کی تحقیق کی اور مجرموں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی۔ انجمن اور اُس کے ملحقہ اداروں میں اصلاحی تبدیلیاں کیں اور اس طرح اس عظیم الشان ادارے میں نئی روح پھونک دی [1]"

نیا انقلاب بحقِ انجمن بہت سازگار ہوا۔ اسی کے ساتھ حکومت نے ترقیٔ اردو بورڈ قائم کیا لغت کی ترتیب کے لیے بابائے اردو سے درخواست کی جسے انہوں نے بخوشی قبول فرما لیا۔ حکومت نے بابائے اردو کو یہ بھی اجازت دی کہ وہ اپنی پسند کے مددگار وغیرہ انتخاب کرلیں۔ اس پر مولوی عبدالحق مولانا عبدالماجد دریا بادی کو لکھتے ہیں:

"اللہ نے چُپ کی داد دی اور صبر کا پھل ملا۔ انشاء اللہ اب کام پوری مستعدی کے ساتھ شروع ہو جائے گا اور گزشتہ آفات کی تلافی ہو جائے گی [2]"

---

[1] حرفے چند (اداریہ) قومی زبان کراچی، اپریل ۱۹۶۲ء [2] مکتوبات عبدالحق، ۲۲۹

۹

مولوی عبدالحق

انقلاب ۱۹۵۸ء تا انتقال ۱۹۶۱ء

۱۹۶۰ء میں انجمن کے معاملات کسی قدر رو باصلاح ہُوئے تو مولوی عبدُالحق نے تازہ جوش اَور وَلولے کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ کراچی میں اُردو یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اَور اِس ضمن میں عوام سے رابطے اور حصُولِ اِمداد کی مہم کا آغاز کیا۔ اُردو یونیورسٹی کے اِس منصوبے کا منظر و پس منظر خود مولوی عبدُالحق کی زبانی سُنیے :

" عثمانیہ یونیورسٹی کی تجویز، اُس کے منصوبے اَور پھر اُس کے قیام کے ہر ہر مَرحلے پر مشورتی اور عملی طور پر مَیں اس سے وابستہ رہا تھا، اِس لیے جب انجمن ترقیٔ اُردو کا دفتر اورنگ آباد سے دلّی منتقل ہُوا تو مَیں نے ۱۹۳۸ء میں ایک کُل ہند انجمن ترقیٔ اُردو کانفرنس کے اِنعقاد کا فیصلہ کیا، اَور پھر اس کانفرنس میں باتفاق رائے سے (ایک) تجویز منظور ہُوئی کہ ...... کم از کم دلّی، پنجاب، لکھنؤ، علی گڑھ، الہ آباد اور پٹنہ یونیورسٹی میں جلد سے جلد اَعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اُردو قرار دی جائے۔ کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد مَیں نے (اِس) تجویز کے سلسلے میں مُتعلقہ یونیورسٹیوں کے اَربابِ اختیار سے خط و کتابت شرُوع کی لیکن یہ زمانہ سخت سیاسی خلفشار کا تھا اَور دُوسری عالمگیر جنگ کی وجہ سے حالات حد درجہ غیر یقینی ہو گئے تھے، اِس لیے اِس مہم میں کامیابی کی صُورت نہ پیدا ہو سکی ...... یہ دیکھ کر مَیں نے طے کیا کہ انجمن ترقیٔ اُردو ہند کے اہتمام و انتظام میں بُرطانوی ہند کے کسی مَوزوں مقام پر ایک اُردو یونیورسٹی قائم

کی جائے۔ چنانچہ ۲۰۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو تیسری کُل ہند انجمن ترقیٔ اُردو کانفرنس ناگپور کے کُھلے اجلاس میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاق رائے سے... تجویز پاس ہُوئی.... یہ کوئی وقتی اور ہنگامی تجویز نہ تھی بلکہ بہت پہلے سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور مُتعلقہ اصحاب کی رائے و مشورے کے بعد مُرتب ہُوئی اور کانفرنس میں منظوری کے لیے پیش کی گئی تھی.... اُردو یونیورسٹی کے قیام کی اِس اہم اور تاریخی تجویز کا مُلک کے طُول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مُقدم کیا گیا.... ناگ پور کانفرنس کی شرکت سے دلّی واپس آنے پر مَیں نے ایک روز قائدِ اعظم محمّد علی جناحؒ کو اَپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی زحمت دی قائداعظم نے بکمال مہربانی میری دعوت قبُول فرمائی۔ کھانے پر جہاں قومی تعمیر کے مُختلف مسائل پر گفتگو ہوئی۔ مجوّزہ اُردو یونیورسٹی کا بھی ذکر آیا اور قائداعظم نے اُس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا...... اُردو یونیورسٹی کی تجویز کی جس طرح تائید و حمائت کی گئی تھی، اُس کو دیکھتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یہ یونیورسٹی قائم ہو کر رہے گی لیکن اس کے بعد ہی بدلتے ہُوئے سیاسی حالات نے اِتنا مَوقع نہ دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا یہاں تک کہ نوبت تقسیمِ مُلک تک پہنچ گئی اور سارے ارادے دل کے دل میں رہ گئے لیکن اس کے باوجود ابھی اُمید کی ایک کرن باقی تھی اور بجھی ہوئی راکھ میں ایک چنگاری روشن تھی کہ اگر ہندوستان میں ناگپور کی تجویز عمل میں نہ آسکی تو پاکستان میں تو اِسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے گی....

جب مَیں نے دلّی میں قائداعظم سے اُردو یونیورسٹی کے بارے میں گفتگو

کی تھی تو انہوں نے اس سے بڑی دل چسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور مجھے قوی اُمید تھی کہ میں اُن کی امداد و اعانت سے کراچی میں اُردو یونیورسٹی کے قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا لیکن اُس وقت خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ قائداعظم ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے اور اُن کے بعد ہماری بدنصیبی سے زبان کا طے شدہ مسئلہ بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا اور پھر خود غرض اور مفاد پرست سیاست کاروں کی بدولت اِس نے ایک "فتنۂ بیدار" کی شکل اختیار کر لی لیکن مَیں اُس وقت بھی مایوس نہ ہُوا اور مَیں نے اللہ کا نام لے کر ... کراچی میں انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان کے زیرِ اہتمام اُردو کالج قائم کیا جو خُدا کے فضل و کرم سے اَب بھی کامیابی سے چل رہا ہے اور جس میں بی۔ اے، بی ایس سی، بی۔ کام اور ایل ایل۔ بی تک اُردو کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے اور (۱۹۶۰ء) سے چند سال پہلے ایم۔ اے کی تعلیم بھی اس میں اُردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔

مَوجودہ اِنقلابی حکومت کے مُقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے بھی انجمن کے اُردو کالج میں قومی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے کامیاب تجربے کا اعتراف کیا ہے اور اس خیال کا بھی اِظہار کیا ہے کہ یہ تجربہ جاری رہنا چاہیے .. ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ مجھے تو اُردو کا روگ لگ گیا ہے ...... عربی کی ایک مشہور مثل ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے مجھے اُردو سے محبت ہے اور مجھے اِعتراف ہے کہ یہ محبت جُنون کی حد تک ہے لیکن اِسی کے ساتھ مَیں یہ بھی کہنا چاہتا ہُوں کہ اُردو سے میری وابستگی کا یہ سلسلہ پُوری قوم کی تہذیب، ثقافت، تصورات و نظریات اور اس کے عزائم اَور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون اَیسا

بدبخت ہے، جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہوگی[1]"

○

"میں بے وجہ مارا مارا نہیں پھر رہا مجھے دیوانے کتّے نے نہیں کاٹا۔ میں جانتا ہوں کہ اس عمر میں مجھے آسائش کی ضرورت ہے علاوہ اس کے کئی ضروری علمی اور ادبی ایسے کام ہیں جنہیں ۔۔۔۔ بیٹھ کر پورا کرنے کی ضرورت ہے لیکن کیا کروں مجبور ہوں[2]"

○

"یہ سچ ہے کہ میں اپنی عمر کی نوّے منزلیں طے کر چکا ہوں لیکن میرے ارادے اب بھی جوان ہیں اور میرا عزم و حوصلہ اب بھی زندگی کی حرارت سے سرشار ہے۔ میرے سامنے ایک مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل ہی میری زندگی کا حاصل ہے اور وہ مقصد ہے جلد سے جلد کراچی میں ایک چارٹرڈ اردو یونیورسٹی کا قیام ۔۔۔۔

۔۔۔ میں اب زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔ کراچی میں اردو یونیورسٹی بن کر رہے گی یہ خود قضا و قدر کا منشا ہے، سوال دیر سویر کا ہے۔ اگر آپ (اہلِ وطن) نے میری مدد کی اور یونیورسٹی کے قیام کے وسائل و اسباب مہیا کر دیے تو یہ جلد بن جائے گی اور میری زندگی میں بن جائے گی[3]"

○

"مجھے اپنے مشن میں بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں سے سابقہ پڑا ہے۔ دنیا دار التجربہ ہے۔ یہاں سب کچھ صبر و شکر کے ساتھ بھگتنا پڑتا ہے۔ بہت

---

[1] کتابچہ: اردو یونیورسٹی، وقت کا اہم تقاضا، ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۶ تا ۲۴ [2] مکتوبات، ۱۸۲

[3] کتابچہ: اردو یونیورسٹی، وقت کا اہم تقاضا، ۱۹۷۰ء صفحہ ۲۷ و ما بعد

کام پڑا ہے اور بہت کچھ کرنا ہے[1]۔ "بعض اوقات مجھے ....مایوسی ہونے لگتی ہے لیکن میں اس پر کاربند ہوں:

وست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید[2]"

مولوی عبدالحق نے اسے پورا کر دکھایا۔ وہ زندگی کے آخری لمحے تک اسی اصول پر کاربند اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے یہاں تک کہ چراغ انجمن افروز گُل ہو گیا' ۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء کے روز انجمن کی روح رواں، بابائے اردو کی روحِ پرفتوح مادے کی قید سے آزاد ہو گئی۔ زکریا مائل نے:

"ہائے آفتاب اُردو غروب ہو گیا" سے سالِ رحلت استخراج کیا۔

مولوی عبدالحق ــ سرسید، حالی اور شبلی کی آنکھیں دیکھے اور صحبتیں اُٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اسلاف کی قیمتی یادگار اور ہماری لسانی و تہذیبی زندگی کے بہت بڑے معمار تھے۔ اُردو کی خدمت کو اُنہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرایا اور پھر اپنی طویل زندگی کے کسی لمحے، وہ اس کی صلاح و اصلاح اور بقا و ارتقاء کی طرف سے غافل نہیں ہوئے۔

کسی زبان کی خدمت دو طرح ممکن ہے[3]: ایک تو اس طرح کہ اُس کے علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کیا جائے اور دوسرے یوں کہ اُس کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور مقبول بنانے کے وسائل پیدا کیے جائیں اور اس زبان کے بولنے والوں میں یہ احساس بیدار اور پختہ کیا جائے کہ زبان سے بے اعتنائی، گویا خود اپنی ذات، اپنی انفرادیت اور اپنے مفاد سے بے اعتنائی ہے۔ پہلا کام اس زبان کے ادیبوں اور شاعروں کا ہے اُردو میں اس طرح کے کارکنوں اور

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، ۲۵۹ [2] مکتوباتِ عبدالحق، ۳۹۵

[3] استفادہ: آمنہ صدیقی، نقدِ عبدالحق، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۱۹۶۸ء، ص ۲۷۰

کارگزاروں کی کمی نہیں رہی ۔ دوسرا کام بظاہر آسان ، لیکن حقیقت میں زیادہ مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اِس نقطۂ نظر سے اُردو کی خدمت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ۔ — اور ایسے لوگوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے جنہوں نے دونوں محاذوں پہ زبان کو سنوارا اور سنبھالا ہو ۔ اُردو کے علمی و اَدبی ذخیرے میں اضافہ بھی کیا ہو اور اُردو کی بقا اور اس کے ارتقار کے لیے مُسلسل جد وجہد بھی کی ہو ۔ مولوی عبدُالحق کا شمار اُردو کے ایسے ہی کمیاب خدمت گذاروں اور معماروں میں ہے —

مولوی عبدُالحق کی زندگی کو ہم کسی زاویے سے بھی دیکھیں ، اسے اپنی جگہ اِس قدر مُفید ، اور مُکمل و مُنفرد پاتے ہیں کہ اُن کا سا جامع صفات اُبھرتا اَب کوئی نظر نہیں آتا ۔ حق یہ ہے کہ سرسیّد کی ملّی و لسانی تحریک کے اِس عملی مجاہد ، اِس صاحبِ بصیرت ہستی کو جس کی ساری زندگی ، ایک اَبرِ فیض کی طرح موتی برساتی گزری ، ہم سدا یاد رکھیں گے ۔

"مولوی عبدُالحق ، تحقیق ، تنقید ، تصنیف ، تالیف اور لسانی خدمت کی صُورت میں جو کچھ کر چکے ، وُہ ناقابلِ فراموش کارنامے ہیں ۔"

— پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فارُوقی

۱۰

اِشاریۂ تصانیفِ عبدُالحق

۱۹۰۱ء — ۱۹۶۱ء

"مستقبل کا مورخ جب بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اردو کے لسانیاتی اور تنقیدی سرمائے کا جائزہ لے گا تو اسے مولوی عبدالحق کے مُہتم بالشان کارناموں کی صحیح عظمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ تاریخِ زبان کے بارے میں آپ کے انکشافات، قواعد زبان کی تدوین اور لغتِ اردو کی تالیف، مطالعۂ لسانیات کی راہ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں قدیم ادب کے شاہکاروں، شعراء کے دواوین وانتخابات اور بیش قیمت مسودوں اور تذکروں کو مولوی عبدالحق نے جس دقتِ نظر اور حسنِ ذوق کے ساتھ پیش کیا ہے، اُس کی بدولت، اردو کو ترتیب و تدوینِ کتب کا ایسا بلند معیار مل گیا ہے جس سے وہ پہلے آشنا نہ تھی۔"

— پروفیسر حمید احمد خاں

"مولوی عبدالحق نے اوّل اوّل اردو ادب کے قدیم دکنی شعراء کے کلام کو ترتیب دیا اور ان پر تحقیقی و تنقیدی مقدمے لکھے۔ اردو شعراء کے تذکرے جدید اصولِ ترتیب و تدوین کے مطابق شائع کیے بعض شعراء پر تنقیدی مقالات لکھے اور ان کے کلام کا انتخاب کیا۔ اردو زبان کی پہلی اور آخری معیاری قواعد لکھی، جامع اور مکمل تاریخی لغت کی داغ بیل ڈالی فنی و علمی اصطلاحات کے اردو میں مناسب و برمحل ترجمے ہی نہیں کیے، ترجمے کے اصول بنائے۔ اردو تحریر میں اصلاحات کیں، اوقاف کے ضابطے اور ان کی علامات مقرر فرمائیں۔ اپنے ہم عصروں کے جیتے جاگتے مرقعے تیار کیے۔ یہ جامعیت کبھی اردو کے کلاسیکی انشاپردازوں میں ہوا کرتی تھی۔"

— ڈاکٹر شوکت سبزواری

تصنیفات و تالیفات:

۱۔ قواعدِ اُردو: طبع اوّل، ۱۹۱۴ء، ص ۲۷۱

طبع دوم، ۱۹۲۶ء، ص ۳۰۱

طبع سوم، ۱۹۳۶ء، ص ۳۲۴

۲۔ اُردو صرف و نحو:

مطبوعہ، ۱۹۳۴ء، ص ۱۴۸

مطبوعہ، ۱۹۶۱ء، ص ۱۷۵

۳۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۳

۴۔ قدیم اُردو: طبع اوّل، ۱۹۶۱ء، ص ۲۵۵

۵۔ اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصّہ:

طبع سوم: ۱۹۵۳ء، ص ۸۴

۶۔ اُردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ، ۱۹۴۹ء، ص ۵۵

۷۔ اُردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم سائنس، ۱۹۵۹ء، ص ۴۷

۸۔ مرحوم دھلی کالج:

طبع دوم، ۱۹۴۵ء، ص ۱۷۵

طبع سوم، ۱۹۶۲ء، ص ۱۸۲

۹۔ نصرتی، ملک الشعرائے بیجاپور:

۱۹۴۴ء، ص ۳۳۷+۱۱

۱۰- چند ہم عصر (شیخ چاند):

طبع اوّل ۱۹۳۷ء، ص ۱۵۱

طبع ششم ۱۹۵۹ء، ص ۴۷۲

۱۱- سر سید احمد خاں - حالات و افکار، ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۶

۱۲- مکتوبات بابائے اردو بنام: حکیم امامی، ۱۹۶۰ء، ص ۲۰۸

۱۳- اُردوئے مصفّٰی (ابو تمیم فرید آبادی)، ۱۹۶۱ء، ص ۴۸۴

۱۴- مکتوباتِ عبدالحق (جلیل قدوائی)، ، ۱۹۶۲ء، ص ۶۷۸

۱۵- مکتوبات بابائے اُردو بنام پیر حسام الدین راشدی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۲

۱۶- خطوطِ عبدالحق (محمد اکبر الدین صدیقی)، ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۰

۱۷- عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام (افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق)، ۱۹۶۸ء

۱۸- چند تنقیداتِ عبدالحق ، ۱۹۳۹ء، ص ۸۰

۱۹- تنقیداتِ عبدالحق (محمد تراب علی خاں باز)، ۱۹۴۵ء ص ۱۵۲

۲۰- ادبی تبصرے: ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۴ء، ص ۸۸

۲۱- مقدّماتِ عبدالحق (مرزا محمد بیگ)، ۱۹۳۱ء:

حصّہ اوّل، ص ۴۰۹، حصّہ دوم، ص ۲۱۲

مُرتبہ: عبادت بریلوی، ۱۹۶۴ء، ص ۸۰۰

۲۲- خُطباتِ عبدالحق: حصّہ اوّل، ۱۹۳۹ء، ص ۱۷۲

حصّہ دوم، ۱۹۴۴ء، ص ۱۹۰

مُرتبہ: عبادت بریلوی، ۱۹۵۲ء، ص ۵۵۳

۱۹۶۴ء، ص ۶۳۶

۲۳ - اُردو زبان کی فضیلت چند بنگالی اکابر کی نظر میں، ۱۹۵۰ء، ص ۱۲۶

۲۴ - پاکستان میں اُردو کا المیہ، ۱۹۵۸ء، ص ۸۶

۲۵ - اُردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا، ۱۹۶۰ء، ص ۳۲

۲۶ - سر آغا خاں کی اُردو نوازی، ۱۹۵۱ء، ص ۲۰

۲۷ - افکارِ عبدالحق (مرتبہ: آمنہ صدیقی، ۱۹۶۲ء، ص ۳۵۲

اِنتخابات اور مُتفرقات:

۲۸ - انتخابِ کلامِ میر، طبع ششم ۱۹۵۰ء، ص ۲۵۸

۲۹ - انتخابِ داغ، ۱۹۴۶ء، ص ۱۷۶

۳۰ - نصابِ اُردو (اِنٹر کے لیے)، ۱۹۴۰ء، ص ۲۲۷

۳۱ - بچوں کے خطوط، ۱۹۰۱ء، حصّہ اوّل، ص ۴۴؛ حصّہ دوم، ص ۷۰

۳۲ - انجمن ترقیٔ اُردو کی سالانہ رُودادیں، ۱۹۱۳ء ——— ۱۹۶۰ء

۳۳ - انجمن ترقیٔ اُردو کا المیہ، ۱۹۵۸ء، ص ۸۶

۳۴ - لُغتِ کبیر اُردو، حصّہ اوّل، مطبوعہ ۱۹۷۰ء

۳۵ - العالم الاسلامی، ۱۹۰۸ء، ص ۲۴۸

۳۶ - اکبر کی تمدّنی اصلاحیں، ۱۹۰۶ء ص ۳۰

۳۷ - میٹریکولیشن کا اُردو نصاب، ص ۴۱۳، ۱۹۴۰ء

۳۸ - ہماری زبان (خطبہ)، ۱۹۴۱ء، ص ۷۸

۳۹ - اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام (ترجمہ): حصّہ اوّل ۱۹۱۰ء، ص ۱۵۲

۳۹، الف - تحقیق الجہاد (ترجمہ) - : حصّہ دوم ۱۹۱۱ء ص ۸۰، متن ص ۸۴

مرتباتِ قدیم (کلاسیکی ادب، نظم و نثر، تذکرے):

۴۰۔ ذکرِ میر (خود نوشت)، میر تقی میر، ۱۹۲۸ء ص ۱۵۲

۴۱۔ دریائے لطافت، انشاء اللہ خاں انشا، ۱۹۳۵ء، ص ۳۹۵

۴۲۔ باغ و بہار، میر امن دہلوی، طبع دوم ۱۹۴۴ء، ص ۲۲۷

۴۳۔ سب رس، ملا وجہی، طبع دوم، ۱۹۵۲ء، ص ۲۷۶

۴۴۔ معراج العاشقین، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، ۱۹۲۴ء ص ۳۰

۴۵۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی، انشا، طبع دوم، ۱۹۵۵ء، ص ۶۵

۴۶۔ قطب مشتری، ملا وجہی، طبع دوم، ۱۹۵۳ء، ص ۹۶ + ۲۲

۴۷۔ جنگ نامہ عالم علی خاں و آصف جاہ، از غضنفر ۱۹۳۲ء، ص ۶۸

۴۸۔ گلشنِ عشق، نصرتی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۲۳

۴۹۔ علی نامہ، نصرتی، ۱۹۵۲ء

۵۰۔ دیوانِ تاباں، عبدالحیٔ تاباں دہلوی، ۱۹۳۵ء، ص ۲۶۷

۵۱۔ دیوانِ اثر، محمد میر اثر، ۱۹۳۰ء

۵۲۔ مثنوی خواب و خیال، محمد میر اثر، طبع دوم ۱۹۵۰ء، ص ۱۶۷

۵۳۔ تذکرہ گلشنِ ہند، مرزا علی لطف، ۱۹۰۶ء

۵۴۔ تذکرۂ ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، ۱۹۳۳ء، ص ۲۸۳

۵۵۔ چمنستانِ شعراء، لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، ۱۹۲۸ء، ص ۵۶۵

۵۶۔ مخزنِ نکات، قائم چاندپوری، ۱۹۲۹ء، ص ۷۹

۵۷۔ مخزنِ شعراء، نور الدین حسین خاں فائق رضوی، ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۰

۵۸۔ تذکرہ ریختہ گویاں، سیّد فتح علی حسینی گردیزی، ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۸

۵۹۔ ریاض الفصحاء، غلام ہمدانی مصحفی، ۱۹۳۴ء، ص ۳۷۸

۶۰۔ عقدِ ثریا، غلام ہمدانی مصحفی، ۱۹۳۴ء، ص ۶۴

۶۱۔ نکات الشعراء، میر تقی میر، ۱۹۳۵ء ص ۱۸۹

۶۲۔ مآثر الکرام، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، ۱۹۱۰ء، ص ۳۵۰

۶۳۔ گلِ عجائب، اسد علی تمنا اورنگ آبادی، ۱۹۳۶ء، ص ۱۱۶

انگریزی مطبوعات:

64. Letters by Moulvi Abdul Haq
Addressed to: Vanshidhar Vidyalankar
Edited by: M. Akbar-uddin Siddiqi
1966, p. 33

65. Memorandum on Scientific Terminology in Urdu, 1950, p. 24

66. Popular English Urdu Dictionary
1957, p. 663

67. Standard English Urdu Dictionary
1937, p. 1513+13+12

68. Students Standard English Urdu Dictionary

69. Urdu as Medium of Instruction for Science, 1952.

o

ذکرِ عبدالحق

(سیرت و شخصیت)

"چند ہم عصر" کے نگار خانے میں قدم قدم پر ہمیں مولوی عبدالحق کی سیرت و شخصیت کی جھلکیاں اور پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اِس کتاب میں اُنہوں نے اپنے چند ہم عصروں اور ہم نشینوں کی سیرت و کردار کے جو خاکے اور نقشے تیار کیے ہیں، اُن میں جاننے والوں کے لیے خود مولوی عبدالحق کے اپنے "رنگِ طبیعت" کا مُشاہدہ کرنا زیادہ مُشکل نہیں۔

"ذکرِ عبدالحق" کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ در بیانِ حکایتِ دیگراں مولوی عبدالحق نے اپنی ذات و صفات سے کس طرح بے اختیارانہ حجاب اٹھائے ہیں۔ یہ تمام کا تمام حصۂ کتاب مولوی عبدالحق کی زبان و بیان میں ہے جسے میں نے "چند ہم عصر" کے شخصی مضامین سے اخذ و انتخاب کر کے، ترتیب و تشکیل دیا ہے۔ اصل عبارت کے حوالے صفحہ وار ذیلی حاشیے میں دے دیے گئے ہیں۔"

— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

"کسی شخص کی سیرت کی گہرائیوں کو سمجھنے کے لیے خود اُس کی شہادت کی بھی ضرورت ہوتی ہے مگر بلا واسطہ شہادت، اِس معاملے میں اتنی اہمیت نہیں رکھتی، جتنی بالواسطہ شہادت۔ کیونکہ خود اپنا ذکر کرتے ہُوئے اِنسان عمُوماً انکسار یا افتخار، خُود لوشی یا خُود نمائی سے کام لیتا ہے اور اصلیت کو گھٹا کر یا بڑھا کر بیان کرتا ہے۔ دوسروں کا ذکر کرتے وقت، وُہ غیر شعوری طور پر اپنی اصلی حالت ظاہر کر دیتا ہے۔ اگر اُس کی شخصیت کا صحیح اندازہ مقصود ہو تو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وُہ کن لوگوں کو پسند کرتا ہے اور اُن کی کون سی صفات اُسے کس حد تک متاثر کرتی ہیں۔ اِس نکتے کو مدِ نظر رکھ کر مولوی عبدالحق کی تنقیدی تحریروں خصُوصاً "چند ہم عصر" کا مطالعہ کیجیے۔ اِن رنگا رنگ صُورتوں میں خود اُن کی سیرت کی جھلک دیکھیے اور عالمِ تصوّر میں اُن کی زبان سے یہ شعر سُن کر لُطف اُٹھایئے:

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

—— ڈاکٹر سیّد عابد حسین

خطاب یا نام اٹکل سے رکھ دیے جاتے ہیں، مُسمّی کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا۔ نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں، عطائے خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا "بابائے اردو" عبدالحق مرحوم کا نام اور خطاب (دونوں) اُن کے لیے بہت ہی موزوں نکلے ––– فرہاد کو شیریں سے اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا اُنھیں (اردو) سے تھا۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، یہی اُن کا ورد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنافی (الاردو) کے درجے کو پہنچ گئے تھے (اور) سچائی، بات کی اور معاملے کی، اُن کی سرشت میں تھی خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے، وہ سچ کہنے سے کبھی نہ چوکتے تھے اس میں اُنھیں نقصان بھی اُٹھانے پڑے، مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) مرحوم "عجیب وغریب" شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر اُنھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت وشان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔

وہ بہت بڑے ادیب، زبردست انشاپرداز اور اعلیٰ درجے کے مقرر تھے ......

وہ آزادی کے دل دادہ اور جبر واستبداد کے پکے دشمن تھے لیکن اگر کبھی اُن کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑے جابر اور مستبد ہوتے۔ وہ محبت ومروّت کے پتلے تھے اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتے تھے کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اُن کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔ وہ اپنے

۱؎ "چند ہم عصر": صفحہ ۱۳۹ محسن الملک ۲؎ صفحہ ۳۲۸ سر سید احمد خاں

۳؎ صفحہ ۱۳۴ گدڑی کا لال نور خاں ۴؎ صفحہ ۵۳ - ۱۵۲ مولانا محمد علی جوہر

رفیقوں اور ہم کاروں کے ساتھ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش آتے تھے اور طرح طرح کے سلوک کرتے تھے، لیکن جب بگڑتے تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے اُس وقت اُنھیں نہ کسی کی عزت و آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا۔ اِسی لیے وہ ہم کاروں سے نباہ نہ سکے اور وہ لوگ جنھیں وہ چُن چُن کر لائے تھے، آخر کار ایک ایک کر کے الگ ہو گئے (لیکن[۱]) خفا ہو جانے کے بعد پھر ملتے تو بالکل صاف ہو جاتے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ اُن میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔

مرحوم[۲] (ہاپوڑ) کے ایک نہایت شریف و نجیب خاندان سے تھے۔ شادی[۳] آخر عمر تک نہ کی۔ وہ میانہ قد اور (اکہرے) جسم کے آدمی تھے۔ چہرے سے اُن کے رعب داب اور متانت ٹپکتی تھی۔ چہرہ بھاری بھر کم، سر بڑا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ سفید[۴] گول داڑھی رکھتے اور ہمیشہ شیروانی پہنتے۔ اُن کی ٹوپی[۵] اکثر ترکی ہوتی تھی۔ کھلا گندمی[۶] رنگ، خوبرو آدمی تھے ..... سفید ڈاڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی... جامہ زیب تھے ہمیشہ ہندوستانی لباس پہنتے تھے ..... اُن کے قویٰ بہت اچھے تھے۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ[۸] کہا کرتے تھے کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوا اور نہ کبھی میرا سر دُکھا۔ کبھی کبھار زکام البتہ ہو جاتا ہے، اس سے یہ فائدہ ہے کہ دماغ صاف ہو جاتا ہے اُن کا[۹] ...... پُر رعب چہرہ، اُن کی شان اور اُن کا وقار ایسا تھا کہ درحقیقت وہ زیارت کے قابل تھے۔ اُن کے[۱۰] اکثر ہم عصر اور ہم رتبہ لوگ اُن کا بہت احترام اور ادب کرتے تھے اس طرح

---

[۱] صفحہ ۱۰۶ مولوی سید علی بلگرامی [۲] صفحہ ۶۷ مولوی سید علی بلگرامی [۳] صفحہ ۲۷۲ دردیش پروفیسر ری ہٹ سک [۴] صفحہ ۸۴ مولوی چراغ علی [۵] صفحہ ۵۵۴ خالدہ ادیب خانم

[۶] صفحہ ۲۶۱ مولانا حسرت موہانی [۷] صفحہ ۳۰۴ نواب عماد الملک [۸] صفحہ ۳۷۴ دردیش پروفیسر ری ہٹ سک [۹] صفحہ ۱۸۵ سر سید راس مسعود [۱۰] صفحہ ۸۴ مولوی چراغ علی

ملتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل و صورت کے لوگوں پر اُن کے علم و فضل اور قابلیت کا بھی رُعب پڑتا تھا۔[1]

مرحوم لڑکپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی آپ اپنے ہمسروں میں مُمتاز رہے اور (اعزاز) کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تمام طالب علم[2] (سوائے بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر اُنھیں وُقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے..... خود سر سید مرحوم اُنھیں اُن کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔[3] مرحوم کی یہ خُوش نصیبی تھی کہ اُنھوں نے بزمانۂ قیام (علی گڑھ) ایسے ماہرینِ فن اور عُلمائے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو اُس وقت آسمانِ فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے مثلاً پروفیسر (آرنلڈ) پروفیسر (بیک) پروفیسر (ماریسن اور شبلی وغیرہ) جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتا تھا۔ علی گڑھ[4] کالج میں اُن سے پہلے اور غالباً اُن کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہُوا جس کا مُطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا اَن تھک ہو...... وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے..... وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے۔[5]

یہ (مولوی عبدُالحق) کی خوش نصیبی تھی کہ اُن کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور اُن میں انسانی اَخلاق کی بہت سی خُوبیاں تھیں (مولوی عبدُالحق) کی زندگی پر اُن کا بڑا اثر تھا۔ جس طرح[6] اُنھیں طالب علمی میں مولانا (شبلی) جیسے بے مثل ادیب اُستاد ملے اُسی طرح اس کے بعد سر سید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اُن کے خیالات اور ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا مگر وُہ عمر بھر طالب علم ہی رہے۔ مصلحت

---

[1] صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا
[2] صفحہ ۱۰۸ خواجہ غلام الثقلین
[3] صفحہ ۱۷ مولوی سید علی بلگرامی
[4] صفحہ ۱۰۹ خواجہ غلام الثقلین
[5] صفحہ ۳۰۴۶ سر سید احمد خاں
[6] صفحہ ۱۲۰ مولانا وحید الدین سلیم

وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی بدنصیبی سے اُنھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اِس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیے اور کچھ صحبت اور تجربہ، اِن میں سے اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایّامِ[1] طالب علمی و ملازمت میں وُہ جہاں کہیں رہے اُنھوں نے اپنے فرضِ منصبی کو ایسی مستعدی و جفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہو گئے اور جب قومی خدمت پر کمر باندھی تو اسے بھی خوش اسلوبی، بے نفسی اور بے حیائی کے ساتھ انجام دیا اور ثابت کر دیا کہ حُبِّ وطن اور قومی درد کسی خاص طبقے یا کسی خاص عُمر پر موقوف نہیں ہے

اُن[2] میں وُہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک شریف انسان میں ہونی چاہییں ــ گھر میں اُن کی تربیت والدہ کی زیرِ نگرانی ہوئی اور یہ ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اس فرزانہ اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے اُن کے دل میں بٹھا دیے تھے وُہ عمر بھر نہ بھولے اور اُن پر عامل رہے۔ بڑے ہو کر جو صحبت ملی وُہ اس زمانے کے بہترین افراد تھے۔ اُن میں سے ہر ایک جوہرِ قابل تھا۔ اُن کے نام اَب تک ہمارے ادب میں عزت سے لیے جاتے ہیں۔ تربیت اور صحبت بڑی چیز ہے۔ علم سے لگاؤ تھا۔ اہلِ علم اور اربابِ سخن کی صحبت نے صحیح ذوق پیدا کیا۔ مطالعے کا شوق پہلے سے تھا۔ غور و فکر اور نکتہ رسی کا ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا اُن سب کے بل پر اُنھوں نے وُہ وُہ کام کیے جو رہتی دُنیا تک یادگار رہیں گے۔

طالب[3] علمی سے فارغ ہونے کے بعد وُہ حیدرآباد آئے۔ اگرچہ ابتدا میں وُہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن خداداد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے اُنھوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اِس[4] میں شک نہیں کہ جامعۂ عثمانیہ کو مولانا سے بہتر پروفیسر نہیں مل سکتا تھا۔

---

[1] صفحہ ۶۶ مولوی محمد عزیز مرزا　　[2] صفحہ ۳۳۱ سر سید احمد خاں

[3] صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا　　[4] صفحہ ۱۲۰ مولینا وحید الدین سلیم پانی پتی

شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے وہاں اُردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو۔ اُنھوں نے اس جامعہ کے طلبہ میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا وُہ اُنھیں کا کام تھا، اور یہ بہت بڑا احسان ہے۔ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وُہ اپنا رستہ خُود نکال لیتا ہے۔

حیدرآباد[1] کی زندگی عجیب و غریب زندگی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ یہاں کے اطراف وحوالی کا اثر انسان پر نہ پڑے اور کچھ نہیں تو کاہل تو ضرور ہی ہو جاتا ہے لیکن مرحوم کی جفاکشی اور مستعدی میں آخر دم تک فرق نہ آیا۔ وُہ کبھی راست بازی اور دیانت کے راستے سے نہ بھٹکے۔ اُن کی زندگی جیسی سادہ اور بے ریا پہلے تھی ویسے ہی آخر دم تک رہی۔ غالباً[2] مولوی (عبدالحق) سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری کام کو بے لاگ، بے تعلق اور بے لوث رہ کر سر انجام نہ دیا ہوگا۔ وُہ رعایت اور جانب داری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات میں وُہ بالکل بھول جاتے تھے کہ اُن کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیشِ نظر رہتے تھے اور اُنھیں پر سے وُہ بلا رُو رعایت فیصلہ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ حیدرآباد جو اِن باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں رہے۔ لیکن آخر[3] میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا مگر بے عیب ذات خُدا کی ہے کون ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور خاص کر یہ ضعف نہ ہو۔ اُن[4] کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریا تھی۔ باوجود جاہ و منصب اور قیامِ حیدرآباد کے کبھی بھولے سے بھی راحت و عیش کی طرف مائل نہ ہوئے اور ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

۱؎ صفحہ ۶۴ مولوی محمد عزیز مرزا ۲؎ صفحہ ۲۶-۲۵ مولوی چراغ علی

۳؎ صفحہ ۶۵-۶۴ مولوی محمد عزیز مرزا ۴؎ صفحہ ۶۳ مولوی محمد عزیز مرزا

جب[1] اہلِ علم میں سے کوئی شخص حیدر آباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو اُن کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ اُن کا مہمان ہو چنانچہ (مختلف موقعوں پر مشہور قوم پرست تُرک خاتون خالدہ ادیب خانم اور رؤف بیگ، سابق امیرُالبحر تُرکی) جب حیدر آباد تشریف لائے تو مولوی (عبدُالحق مرحوم) کے مہمان ہوئے۔

کوئی[2] (پچاس) سال ہوتے ہیں جب ...... آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے چند صیغے الگ الگ قائم ہوئے (ترقی اُردو) کا صیغہ اُن کے سپرد ہُوا۔ اُنھوں نے اپنے اِس فرض کو جس مُستعدی اور قابلیت سے انجام دیا وُہ مخفی نہیں ہے۔ کانفرنس کے کئی صیغے تھے اور ان کے بعض سیکرٹری بھی اُن سے زیادہ نامور لوگ تھے لیکن جیسا (ترقی اُردو) کا صیغہ چمکا وُہ بات کسی دُوسرے کو نصیب نہیں ہُوئی۔

(شیخ سر عبد[3] القادر) کے اِنتقال کے بعد انجمن ترقیٔ اُردو کے صدر (عبدُالحق) ہی مُنتخب ہُوئے۔ انجمن سے اُنھیں بڑا شغف تھا اور اس پر اُن کا بڑا احسان ہے۔ اس کے لیے اُنھوں نے جگہ جگہ سے چندے وُصول کیے (اور) بلا مُبالغہ[4] سخنے، قدمے، دامے، مدد دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا بلکہ سب سے آگے رہتے تھے۔ انجمن پر جب کوئی کٹھن وقت آیا تو وُہ اِس کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ وُہ اپنی[5] ذات سے ایک انجمن تھے!

مرحوم[6] نے حیدر آباد سے ایک اَدبی رسالہ ("اُردو") نامی (۱۹۲۱ء) میں جاری کیا تھا جس کے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے۔ سالہا[7] سال تک (یہ رسالہ) اُن کی اِدارت میں نکلتا

---

[1] صفحہ ۹۰ مولوی سیّد علی بلگرامی — [2] صفحہ ۱۱۰ غلام الثقلین

[3] صفحہ ۲۰۲ سر سیّد راس مسعود — [4] صفحہ ۳۶۶ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی

[5] صفحہ ۱۱۷ حکیم امتیاز الدین — [6] صفحہ ۷۷ مولوی سیّد علی بلگرامی

[7] صفحہ ۳۶۲ مولانا حسرت موہانی

رہا۔ اس رسالے نے اَدبی ذوق کے پھیلاؤ میں بڑا کام کیا۔ اس میں اَچھے تنقیدی اور
اَدبی مضمون نکلتے رہے۔ رسالہ اُردو[1] سے اُنھیں خاص لگاؤ تھا۔ (خود) اُن کے بعض
بہترین مضامین "اُردو" میں (ہی) شائع ہوئے (یہ[2] رسالہ) جاری کر کے (اُنھوں نے)
اَپنے اَندازِ تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے (مضمون) نویسی کا پایہ بڑھایا (اس)
کے ذریعہ اُردو ادب میں انقلاب پیدا کیا (اور) ٹائپ کو رواج دیا۔ لیکن[3] افسوس ہے کہ
(یہ رسالہ اُن کے انتقال) کے بعد بند ہو گیا تھا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں کی اَب بھی ضرورت ہے۔

(مرحوم[4]) بحیثیت ایک عام انسان کے ایک عجیب وغریب شخص تھے اور یہی وجہ ہے
کہ اُن کی نسبت رائے قائم کرنے میں اکثر لوگوں کو مُغالطہ ہُوا ہے۔ عموماً ہر شخص دوسرے سے
اَپنی طبیعت اَور مزاج کے مُطابق توقع رکھتا ہے اَور چونکہ وُہ تقریباً ہر شخص سے جُدا اَور نرالی
طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم لوگ ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور سے قدر کر سکتے
تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش طبع تھے اور دُوسرے اُنھیں اَپنے
وقت کی قدر بہت تھی۔ (وہ[5]) ایک کم سخن ...... فلاسفر مزاج، کوہِ وقار، عالی خیال
شخص تھے (اور وقت[6]) ایسی بیش بہا شے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔
ہر وقت[7] مطالعے یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے اور ایسے وقت میں کسی کی
طرف مُتوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ[8] اسی وجہ سے وُہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے
بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے اُن سے صرف کام کی بات کے سوا دُوسری

۱۔ صفحہ ۱۲۱ مولٰینا وحید الدین سلیم ۔۔۔ ۲۔ صفحہ ۲۸۶ سر سید احمد خاں
۳۔ صفحہ ۷۷ مولوی سید علی بلگرامی ۔۔۔ ۴۔ صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی
۵۔ صفحہ ۲۴ مولوی چراغ علی ۔۔۔ ۶۔ صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی
۷۔ صفحہ ۲۳ مولوی چراغ علی ۔۔۔ ۸۔ صفحہ ۴۱۔۴۰ مولوی چراغ علی

بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے بہت جلد مُلاقات ختم ہو جائے۔ یہی نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے اُنھیں طبعی نفرت تھی اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو وہ بہت جزبز ہوتے تھے ...... اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چھوٹے بچّوں سے بے تکلّف باتیں کرتے تھے اور اُن سے مزے مزے کے سوالات کرتے اور اُن کے سوالوں کے جواب نہایت شرح و بسط اور خوبی کے ساتھ دیتے ...... لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اُس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اُس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچّوں میں جو بھولا پن خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلّفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہے وہ بڑے ہو کر نہیں رہتی۔ بڑے ہو کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تصنّع اور کچھ ادب اور لحاظ مانع ہوتا ہے۔ پھر وہ مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا۔ خوردگی و بزرگی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچّے پیارے ہوتے ہیں اور اگر کوئی بتانے والا ہو تو اُس وقت اُنھیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔

اگرچہ[۳] بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے اور اُن کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے جس میں مافی الضمیر ادا ہو جائے۔ جب کسی مسودے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ اگرچہ[۴] وہ

---

[۱] صفحہ ۴۳ مولوی چراغ علی   [۲] صفحہ ۴۱ مولوی چراغ علی

[۳] صفحہ ۲۸ مولوی چراغ علی   [۴] صفحہ ۵۸ - ۵۷ ڈاکٹر محمد اقبال

خاموش طبع تھے اور اُن میں عالمانہ متانت پائی جاتی تھی لیکن اپنے بے تکلّف دوستوں کی صحبت میں خُوب باتیں کرتے تھے جس سے اُن کی زندہ دِلی کا ثبوت ملتا تھا۔

زندہ[1] دِلی اُن کی فطرت میں تھی۔ اگرچہ عُمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات اور واقعات اُن پر ہجوم کر کے ٹُوٹ پڑے تھے لیکن اُن کی زندہ دلی میں فرق نہ آیا۔ وُہ اپنے بعض ہم عُمر بے تکلّف دوستوں سے بڑی دِل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے بلکہ چھوٹوں سے بھی نہیں چُوکتے تھے۔ یہ زندہ دلی اُن کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی۔ (اُن[2] کے) چہرے پر (بالعموم) مُسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وُہ بچّوں میں بچّے، جوانوں میں جوان اور بُوڑھوں میں بُوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دُوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ اُن سے ملنے اور باتیں کرنے میں غم غلط ہوتا تھا۔ آخر دم تک اُن کی زندہ دِلی ویسی ہی رہی۔ اُن[3] کے دوستوں کو اُن کی زندہ دِلی، خوش طبعی، اُن کے لطیفے اور اُن کے سفر کے عجیب و غریب واقعات...... ہمیشہ یاد آئیں گے۔ اُن[4] کی ظرافت، خُوش طبعی اور شوخی کے چٹکلے اور لطیفے ایک دو نہیں سینکڑوں ہیں جو افسوس کسی نے جمع نہیں کیے اگر اُن کے خُطوط، جو تعداد میں بے شمار تھے یک جا مُرتب ہو جاتے تو اُن میں علاوہ اور بہت سے نُکتوں کے اُن کی ظرافت کے پُر لُطف لطیفے بھی ملتے۔ اُن کے خُطوط کے جو مجموعے شائع ہُوئے ہیں، وُہ اُصل خطوں کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دِلی سلامتِ طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بارِ گراں کو ہلکا کرنے میں سب سے

---

[1] صفحہ ۲۳۷ سر سیّد احمد خاں [2] صفحہ ۱۳۶ گدڑی کا لال نور خاں

[3] صفحہ ۳۶۸ آہ! عبدالرحمن صدیقی [4] صفحہ ۲۴۶ سر سیّد احمد خاں

بڑی مُعین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے،[1] جن صاحبوں کو اس بے نظیر شخص سے ملنے کا اتفاق ہُوا ہے، وُہ خوب جانتے ہیں کہ ہر فن میں خواہ اُدب ہو یا فلسفہ یا تاریخ وُہ ایسی ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ خُود اس فن کے ماہرین بھی دنگ رہ جاتے تھے۔[2] قُدرت نے (مولوی عبدُالحق) مرحوم کو بہت سی خُوبیاں عطا کی تھیں۔ وجاہت، ذہانت، خُوش بیانی اور فیاضی اُن کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا...... اُن میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، اُن سے چھوُا نہیں اور کُندن کا ہُوا نہیں![3] اُن کی باتیں نہایت پُر لطف اور مزے کی ہوتی تھیں۔ اُن میں ایک جادو ہوتا تھا جو سامعین کے دل پر بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ گرویدہ ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ عام و خاص ہر فرقے میں مقبول تھے۔[4] وُہ بڑے پُر اثر اور پُر جوش مقرر تھے اور بلا تکلف[5] تقریر کرتے تھے لیکن تقریر سے زیادہ اُن کی تحریر پُر زور اور شان دار ہوتی تھی۔ چنانچہ اُن کے مضامین اُردو انشا پردازی کے بہت عمدہ نمونے ہیں۔ اُن کے قلم[6] اور آواز میں بڑا زور تھا۔ اُن کے چہرے سے اُن کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ باتیں مزہ لے کر اور ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔ جلدی اُن کے مزاج میں نہ تھی۔ آواز میں[7] شیرینی اور دل کشی تھی۔ اکثر لوگ جو اُن سے ملنے یا کسی مُعاملے میں گفتگو کرنے آتے تو اُن کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔[8]

---

۱ صفحہ ۴/۳ سیّد محمود	۲ صفحہ ۱۳۹ محسن الملک
۳ صفحہ ۴ سیّد محمود	۴ صفحہ ۳۶۶ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی
۵ صفحہ ۶۱ مولوی محمد عزیز مرزا	۶ صفحہ ۱۱۸ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی
۷ صفحہ ۲۲۱ میرن صاحب	۸ صفحہ ۱۴۶ محسن الملک

حافظہ[1] اُن کا بڑے غضب کا تھا، جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وُہ پتھر کی لکیر تھی۔ (وُہ) صُبح[2] کے نو بجے سے شام کے ۵ بجے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اُن[3] کا علم اِس قدر وسیع تھا کہ گویا زندہ اِنسائیکلو پیڈیا تھے، اور اِس لیے اُن کی باتیں نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھیں۔ کِسی قسم کا مسئلہ اور کِسی فن کی بحث اُن کے سامنے پیش کیجئے وُہ کوئی نہ کوئی بات ضرور سمجھا دیتے تھے۔

وُہ بڑے ظریف بھی تھے۔ اُن کی ظرافت عجیب شان کی ظرافت تھی۔ اُن کے ایک ، ٹھٹول میں وُہ وُہ مضمون و نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مُطالعے اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ وُہ ایک چٹکلے میں بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ اُن کے خاص لفظ اور جُملے جن میں جدّت اور طبّاعی کی بُو پائی جاتی تھی اَب تک دلوں میں چبھتے ہیں اُن کا لب و لہجہ (اور) اُن کی شیریں بیانی بعض اَوقات ..... اِنسان کو پھڑکا دیتی تھی۔ اُن کی گفتگو میں جو سحر تھا وُہ مَیں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ علاوہ اِس کے اُن سے باتیں کرنے میں جو سبق حاصل ہوتا تھا وُہ یہ تھا کہ واقعات کے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے ورنہ صحیح نتیجے کا اَخذ کرنا محال ہے۔ رسوم کی پابندی، عادت کی بندھن ہمیشہ بلا اِرادہ بھیڑ چال پر مجبور کرتی ہے اور تقلید اس قدر اَندھا کر دیتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات جو خلافِ عادت ہے نظر نہیں آتی۔ وُہ ہر بات میں ایک نیا پہلو دکھاتے جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا اور معمولی سے معمولی بات میں وُہ شان پیدا کر دیتے تھے جو دُوسروں کو نہیں سُوجھتی تھی اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ اِنسان واقعات کے پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم اِنسان کے مُفید نہیں ہو سکتی لیکن اَفسوس کہ اَب ہم اُن کی صُحبت سے مُستفید

---

[1] صفحہ ۷۰ مولانا سید علی بلگرامی [2] صفحہ ۲۷۳ درویش پروفیسر ہی ہٹ سنگ

[3] صفحہ ۲۰۵ سید محمود

نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو گئے۔ گو وہ ہم میں سے تھے مگر اُن کی باتیں ہم سے نرالی تھیں:

یا وہ جوہر ہی الگ تھا جوہرِ انسان سے ۔۔۔ یا نکلتے اَب نہیں اَیسے جواہر کان سے

وہ[1] بڑے ذکی الحس (اور) کتنی[2] قدر نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ وہ بڑے[3] خود دار (بھی) تھے اور کسی ایسی بات کو جو خود داری کے خلاف ہوتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ[4] جس کام کو لیتے تھے اُس میں ہمہ تن منہمک ہو جاتے تھے اَور چاہتے تھے کہ جو جوش اَور آگ اُن میں ہے وُہی دُوسروں میں بھی ہو لیکن یہ کہاں ہوتا ہے خصوصاً ایسے زمانے میں جہاں ہمیں پتھروں سے سر پھوڑنا ہے، نتیجہ ظاہر ہے کہ مایوسی ہوتی ہے اور یہ مایوسی اُنھیں پریشان[5] کر دیتی تھی۔ چنانچہ انھیں ناکامیوں، اَور ناکامیابیوں نے اُنھیں ایک بار (صدرِ مملکت وقت کے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے رُجوع ..... ہونے پر) مجبور کیا۔

مخالفت[6] سہنے کا اُن میں عجیب و غریب مادّہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اَوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر (ضرور) غصہ آتا تھا خاص کر جب[7] کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تو اُنھیں بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ (وہ[8]) دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آجاتے تھے کارزارِ دُنیا میں لڑے سے بھڑے کام نہیں چلتا یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے

---

[1] صفحہ ۱۹۸ سر سید راس مسعود — [2] صفحہ ۲۰۱ سر سید راس مسعود

[3] صفحہ ۳۴۳ سر سید احمد خاں — [4] صفحہ ۱۱۱ خواجہ غلام الثقلین

[5] صفحہ ۲۰۷ حالی — [6] صفحہ ۱۹۸ سر سید راس مسعود

[7] صفحہ ۲۴۰ سر سید احمد خاں — [8] صفحہ ۱۹۸ سر سید راس مسعود

پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے جو اس کے لیے تیار نہیں اُس کے لیے پسپا ہو جانا ہی بہتر ہے بلکہ سرے سے اِس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے (لیکن) رائے[۱] کے اختلاف سے ذاتی تعلق اور ملاقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ اِن معاملات میں وُہ خوب بحث کرتے اور بعض اوقات شدت کے ساتھ لیکن اُن کا دل صاف رہتا۔ وُہ عمر[۲] بھر مخالفتیں برداشت کرتے رہے اور (آخر آخر) یہ اُن کے لیے معمولی بات ہو گئی تھی۔

وُہ نہایت[۳] تیز فہم، صائب[۴] الرائے، جفاکش[۵]، مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکے تھے۔ کام[۶] سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اُن کی جیت تھی۔ بڑے غور[۷] و خوض کے بعد رائے قائم کرتے اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے گویا وُہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ آدمی[۸] مفکر بھی ہو اور عملی بھی ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ . . . . (وُہ) جو کہتے اور سمجھتے تھے اُس پر عامل بھی تھے۔ وُہ ہمیشہ[۹] علمی مباحثوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے . . . . . اُن کی رایوں میں خاص بات ہوتی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کے دماغ کا نتیجہ ہیں جو غور و فکر کا عادی ہے۔ (لیکن[۱۰]) مرحوم میں ایک بڑا نقص تھا کہ بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے (اور) ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو اُن کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔

عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی

---

[۱] صفحہ ۳۶۲ مولانا حسرت موہانی [۲] صفحہ ۲۴۰ سر سید احمد خاں

[۳] صفحہ ۲۹ مولوی چراغ علی [۴] صفحہ ۱۵ مولوی چراغ علی

[۵] صفحہ ۲۳۰ نام دیو مالی [۶] صفحہ ۲۸ مولوی چراغ علی

[۷] صفحہ ۱۸۰ حالی [۸] صفحہ ۱۱۴ خواجہ غلام الثقلین

[۹] صفحہ ۱۰۶ مولوی سید علی بلگرامی [۱۰] صفحہ ۲۲۸ نام دیو مالی

ہے (لیکن وہ) مستعد[1] ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ۔ دن ہو یا رات ہو، ہر وقت کام کے لیے تیار ۔ بلا[2] کے کام کرنے والے تھے ۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے ("قومی زبان" اور "اردو" کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے ، معترضین کے جواب بھی دیتے تھے ۔ (اردو کالج کے حساب کتاب اور دوسرے اہم کاموں کی نگرانی بھی کرتے تھے ...... خطوط کے جواب لکھتے یا لکھواتے، ملاقاتیوں سے ملتے ..... کس کس کام کا ذکر کیا جائے کاموں کا ایک ہجوم تھا جسے وہ استقلال اور اطمینان سے صبح سے لے کر شام تک برابر کرتے رہتے تھے ۔ بڑھاپے کے زمانے میں بھی ان کے انہماک اور محنت کا یہی حال تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے ہی سے انسان بنتا ہے اور اسی سے اس کی سیرت بنتی ہے اور اسی سے اس کے دماغی اور اخلاقی قوا کی جلا ہوتی ہے ۔ اس سے مراد وہ کام ہے جس کے کرنے میں انسان کو لذت ملے اور شوق اسے اور ابھارے ، ورنہ کام ، کام نہیں رہتا' بیگار ہو جاتی ہے ۔ (عبدالحق) کا یہی حال تھا وہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام ایسے شوق اور تندہی سے کرتے تھے گویا ان کی دنیا اور عافیت کا انحصار اسی پر ہے ۔

ان کے[3] بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی ۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا ۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسے اچھے آدمی تھے ۔ قومیں ایسے ہی لوگوں

---

[1] صفحہ ۳۵ - ۱۳۴ گدڑی کا لال نور خاں [2] صفحہ ۲۶ - ۳۲۵ سر سید احمد خاں

[3] صفحہ ۱۳۷ ، گدڑی کا لال نور خاں

سے بلتی ہیں - کاش ہم میں بہت سے (عبدُالحق) ہوتے!!

وُہ بہت سادہ مزاج، بھولے بھالے اور مُنکسرالمزاج تھے مگر بکارِ (اُردو) ہوشیار اور بکارِ دُنیا بے کار تھے - اُن[3] کی کاردانی اور کارگزاری ریاست حیدرآباد میں ضرب المثل (تھی) وُہ کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی تھے - معاملات کی تہ کو اِس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے اِنھیں معاملات کو ہفتوں اور مہینوں مطالعہ کیا تھا وُہ بھی دیکھتے رہ جاتے تھے - سرکاری خدمت کی کٹھن اور دُشوار منزلوں کو اُنھوں نے ہمیشہ اِس آسانی سے طے کیا کہ کبھی اُن کی طبیعت پر گراں نہ گزرا - جو کام دُوسرے لوگ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں میں طے نہیں کر سکتے تھے، وُہ مرحوم نے دو تین گھنٹوں میں نمٹا دیا اور پھر اس دقیق نظری کے ساتھ کہ کیا مجال کہ کوئی بات رہ جائے - آپ نے فرائض نہایت دیانت داری اور دلچسپی کے ساتھ ادا کیے، اور نہ کبھی کام کرنے سے اُکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا —— تعلیم[4] یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ وُہ جس کام پر ہاتھ ڈالے اُسے حُسن و خُوبی کے ساتھ ادا کرے - خدا[5] نے اُنھیں ایسا جوہر عطا کیا تھا جس کے سامنے بڑی بڑی تصانیف کی کچھ حقیقت نہیں - وُہ جوہر اُن کی غیر معمولی دماغی قوت تھی؛ جو نہ امتحانات کے پاس کرنے سے حاصل ہوتی ہے، نہ کتابوں کے پڑھنے اور فضیلت کی دستار باندھنے سے - مرحوم[6] کی ذہانت، قابلیت اور وسعتِ معلومات پر ایک عالم گواہ ہے -

اگرچہ[7] بظاہر اکھڑ تھے مگر دل میں خلوص تھا ...... اور دوستوں کے قدر دان

---

[1] صفحہ ۲۳۰ نام دیو - مالی [2] صفحہ ۱۵۸ شیخ غلام قادر گرامی

[3] صفحہ ۶۰ مولوی محمد عزیز مرزا [4] صفحہ ۶۱ مولوی محمد عزیز مرزا

[5] صفحہ ۲ سید محمود [6] صفحہ ۶۱ مولوی محمد عزیز مرزا

[7] صفحہ ۱۵۸/۱۵۷ شیخ غلام قادر گرامی

تھے ...... تصنّع سے دُور؛ نہایت بے تکلّف اور آشنا پرست تھے وہ[1] کم آمیز اور دیر آشنا تھے مگر نہایت[2] باوضع دوستی کے پکّے اور صادق القول شخص تھے۔ (اور) جس[3] سے جو تعلّق ہو گیا اُسے آخر دم تک نبھایا ...... وہ اُن کے سچّے ہمدرد اور اُن کی بہبودی اور سلامتی کے خواہاں رہتے ...... وہ دوستی کے مُقابلے میں رشتے ناتے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ "اگر ساری دُنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اگر ساری دُنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے"۔ لیکن اُن کی دوستی آسان نہ تھی۔ وہ[4] کہا کرتے تھے دعوتوں میں جانے اور بہت سے دوست پیدا کرنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور بہت سی فضول اور بے مصرف باتیں کرنی پڑتی ہیں بجز دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی مگر جن کے ساتھ محبّت تھی خُلوصِ دل سے تھی۔

وہ[5] مصیبت کے وقت کام آتے اور ایسی حالت میں بے طلب مدد کے لیے پہنچتے اور جہاں تک اِمکان ہوتا وہ ہر قسم کی مدد کرتے۔ اُن کی دوستی پُرانے لوگوں کی سی دوستی تھی جو دوست کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے اور ہر قسم کی قُربانی کے لیے تیّار ہو جاتے تھے۔ وہ جس طرح دوستی میں پکّے تھے اُسی طرح نفرت میں بھی شدید تھے۔ یہ نفرت کسی ذاتی بنا پر نہ تھی بلکہ جو لوگ بے اُصول ہوتے، ذاتی فائدے کے لیے ایمان بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے یا قوم سے غدّاری کرتے اُن سے نفرت ہی نہیں، اُنھیں

---

[1] صفحہ ۲۳۸ سرسیّد احمد خاں [2] صفحہ ۲۱۱ میرن صاحب

[3] صفحہ ۳۹-۲۳۸ سرسیّد احمد خاں [4] صفحہ ۲/۷۳-۲۷ درویش پروفیسر ری ہٹ سک

[5] صفحہ ۳۶۶/۶۷ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی

سخت عداوت ہو جاتی تھی وُہ ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جو بدتمیز یا گندے ہوتے چُونکہ وُہ خود صاف گو تھے اِس لیے غیبت کو پسند نہیں کرتے تھے خصُوصاً اپنے کسی دوست کے خلاف ایک لفظ بھی گوارا نہ کرتے تھے (وُہ خود بھی) دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دوستی پُرانے وقتوں کی دوستی تھی۔ پُرانے بزرگ اِسی پر عامل تھے کچھ بھی کہے یا کچھ بھی کرے وُہ اُد بدا کے دوست کا ساتھ دیتے۔

قدامت[۱] اور جدّت عجب طرح سے اُن کے مزاج میں سموئی ہوئی تھیں۔ قدامت ایسی کہ اچھے اچھے پُرانے بزرگ اُن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے اور جدّت ایسی کہ نئی روشنی کے ستارے بھی اُن کے آگے ماند تھے۔ وُہ کسی ملازم[۲] کو شکایتیں سُننے کے بعد برطرف نہ کرتے، یہ بات اُن میں پُرانی تہذیب کی تھی۔ مَیں نے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جب اُنھوں نے کسی پر اعتماد کر لیا تو پھر کوئی کچھ کہا کرے اور کیسی ہی شکایت کرے اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اُلٹے خفا ہوتے تھے اِسی قسم کی مُروّت (مولوی عبدُالحق) میں بھی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے "خانۂ مُروّت تباہ" چُنانچہ اُن کے (ایک پروردہ نوجوان) کے معاملے میں یہی ہُوا۔ یہ شخص (لکھنؤ) کے (ایک) مُمتاز خاندان کا تھا...... بارہا اُن تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابلِ اعتماد نہیں ہے (کسی ذریعۂ معاش کے باوجود) بڑی شان سے رہتا ہے۔ اُس کی دیانت مُشتبہ ہے۔ مَیں نے بھی اس شخص کو دیکھا تھا۔ وُہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ اِن شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے کہ شریف زادہ ہے، گھر سے خوشحال ہے۔ وُہ صاف سُتھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اِس سے جلتے ہیں۔

اُن[۳] میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اِس خوش اسلوبی سے باہم ملی

---

۱ صفحہ ۳۴۰ سَر سیّد احمد خاں ۲ صفحہ ۱۱۶ حکیم امتیاز الدّین

۳ صفحہ ۳۴۱ سَر سیّد احمد خاں ۴ صفحہ ۴۳۳ نواب عماد الملک

ہُوئی تھیں کہ اِس امتزاج نے اُن کی روشِ زندگی میں ایک قسم کا حُسن پیدا کر دیا تھا۔ وُہ[1] کبھی کبھی مغربی مزاج کے آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن اکثر وُہ ٹھیٹ ہندی تھے۔ اُن[2] کی طرزِ معاشرت پُرانے اور نئے دونوں طبقے کے لوگوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھی۔

وُہ اگرچہ[3] کبھی کبھی رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن یہ[4] عارضی صُورت ہوتی تھی کچھ دنوں کے بعد یہ کدورت دل سے محو ہو جاتی اور وَیسے ہی خلوص اور محبّت سے ملتے جیسے پہلے مِلا کرتے تھے۔ کبھی[5] دل میں کینہ یا بُغض نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا فیض عام تھا دوست، دُشمن بلا اِمتیاز اس سے مُتمتع ہوتے تھے۔ انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے اُن سے بُرائی کی اُنھوں نے اس کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر اُنھوں نے دُشمنوں کو نوازا۔

حقیقت[6] یہ ہے کہ (مجموعی طور پر) اُن کو دوست بھی اَیسے ملے تھے کہ اُن پر جان چھڑکتے تھے اور یہ اُن کی بڑی خوش نصیبی تھی۔ یہ سب (مولوی عبدُالحق) کے خلوص، سچائی، راست بازی اور محبّت کا اثر تھا۔ اِس[7] جان لیوا بیماری میں (اُن کے رفیق) حکیم اسرار احمد کریوی، اُن کے نیاز مند متینُ الرحمٰن مُرتضٰی لیکچرار شعبۂ صحافت، کراچی یونیورسٹی، اور اُن) کے مُلازم (بنارس خاں) نے جیسی خدمت کی نہ جورو کر سکتی تھی نہ فرزند کر سکتا تھا (یہ) اُن کی خفگی، دُرشتی اور چڑچڑے پن کو ہنس ہنس کے گوارا کرتے تھے اور اُنھیں خُوش رکھنے کی کوشش کرتے۔

۱؎ صفحہ ۲۰۴ سر سیّد راس مسعود ۲؎ صفحہ ۶۳ مولوی محمد عزیز مرزا

۳؎ صفحہ ۶۴ مولوی محمد عزیز مرزا ۴؎ صفحہ ۳۶۷ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی

۵؎ صفحہ ۶۴ مولوی محمد عزیز مرزا ۶؎ صفحہ ۳۴۰ سر سیّد احمد خاں

۷؎ صفحہ ۳۶۷ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی

(مولوی صاحب کو) عامیانہ خیالات سے بہت چڑ[۱] (اور) جھوٹ[۲] سے سخت نفرت تھی۔ جھوٹے کو کبھی مُنہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے شرفا مُروّت میں آکر یا تالیفِ قلوب کی خاطر یا اِس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھُپاتے یا جھوٹ کے مُرتکب ہوتے ہیں یا ایسے کام کی ہامی بھر لیتے ہیں جو وُہ نہیں کر سکتے یا ان کا کرنا اُن کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اِس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے (مولوی عبدُالحق) کا مسلک بالکل صاف تھا، جب وُہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اُسے اپنے اصُول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ وُہ[۳] راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ اُنھوں[۴] نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھُپایا، جو دل میں تھا وُہی اُن کی زبان اور قلم پر تھا۔ کبھی اِس کی پروا نہیں کی کہ اس سے اُن کی ذات کو نقصان پہنچے گا۔ اُن کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے، جب اُن کے خیر اندیش اور مُخلص دوستوں نے اُن کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دُنیاوی اعتبار سے معاملے کی اُونچ نیچ سمجھائی لیکن اُنھوں نے وُہی کیا جو اُن کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرأت سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر اُن کا شعار رہا۔

مصلحت[۵] کا داغ اُن کے دامن پر نہ تھا۔ جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی ٹوک دیتے تھے۔ کبھی یہ نہ سوچا کہ اِس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اُن کی طبیعت سے واقف نہ تھے اُن کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ اُن[۶] کے مذہب میں دل آزاری کُفر تھی لیکن رائے کی آزادی میں

---

[۱] صفحہ ۱۰۴ نواب عماد الملک [۲] صفحہ ۱۵ا نواب عماد الملک

[۳] صفحہ ۱۶ا نواب عماد الملک [۴] صفحہ ۲۳۷ سر سید احمد خاں

[۵] صفحہ ۱۱۹ مولینا وحید الدین سلیم [۶] صفحہ ۳۷۹ ڈاکٹر بجنوری

وہ سب سے آگے تھے۔ وہ اُس[1] قدر راست باز اور بے لاگ تھے کہ سچ بات کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اِس لیے بعض لوگ اُن سے خوش نہیں رہتے تھے مگر اُن کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔

(اُنھوں[2] نے) ہر جگہ سچ کی حمایت اور آزادی کی تائید کی۔ اصول کی خاطر لڑائیاں کیں، نقصان اُٹھایا، دوستوں کی ناراضگی اور لیڈروں کی خفگی برداشت کی لیکن اصول کو نہ چھوڑا۔ وہ حساب[3] کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ[4] انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور اُن کے آداب و تکلّفات کو مُہمل سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حُبِ جاہ و مال میں مُنہمک رہتی ہے اور اسے صرف روپیہ کمانا اور اس کا صَرف کرنا آتا ہے۔ اور باقی کسی دُوسری بات کی پَروا نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو کچھ[5] اچھا نہیں سمجھتے تھے (یُوپی کے مہاجروں) کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ پچاس سال میں فنا ہو جائیں گے، کیونکہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں۔

اُن[6] کا گھر مہمان سرائے تھا۔ آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلّف اُن کے گھر پہنچ جاتے اور وُہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے ..... بعض اوقات ٹولیاں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ اُن کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اُن[7] کی مہمان نوازی دیکھ کر عرب کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہند اور غیر ملک کے سیّاح اور عُلما کے لیے

---

[1] صفحہ ۱۰۹ خواجہ غلام الثقلین — [2] صفحہ ۳۶۵ آہ! عبدالرحمٰن صدّیقی

[3] صفحہ ۱۳۷ گدڑی کا لال نُورخاں — [4] صفحہ ۱۰۳ - ۱۰۲ مولوی سیّد علی بلگرامی

[5] صفحہ ۱۰۱ مولوی سیّد علی بلگرامی — [6] صفحہ ۱۳۵ گدڑی کا لال نُورخاں

[7] صفحہ ۱۰۴ مولوی سیّد علی بلگرامی

اُن کا مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخدلی کے ساتھ حقِ میزبانی ادا کرتے تھے۔ سچّے[1] دل سے خاطر تواضع کرتے اور (مہمان) کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

(مولوی عبدالحق[2]) کی سیرت میں دو مُمتاز خصُوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی، دوسری دردِ دل ...... خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اِس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے (عزت) اور خلوص سے ملتے تھے........ اُن کا رُتبہ بہت بڑا تھا مگر اُنھوں نے کبھی اَپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا اَدب اور چھوٹوں پر شفقت تو وُہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وُہ اَپنے سے چھوٹوں کا بھی اَدب کرتے تھے۔ اِس[3] سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ اُنھوں نے اَپنی کتابوں پر جو اَعلیٰ اور حقیقی مَعنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ "مُرتبہ" لکھا، "مؤلفہ" یا "مُصنّفہ" کا لفظ نہ لکھا۔

وُہ ایک[4] دَردمَند دل رکھتے تھے، مُصیبت زدوں کی داستان سُن کر اُن کا دل بھر آتا تھا اور فوراً مدد کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ اَیسے مُتعدّد واقعات میرے سامنے پیش آئے۔ خُود مَیں نے اُن سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے کام نکالے۔ مُشکل کے وقت اُن کے دوست اُنھیں آگھیرتے تھے۔ وُہ بلا تامّل سینہ سپر ہو جاتے، یہاں تک کہ اُنھوں نے بعض اَیسے دوستوں کو مُصیبت اَور تباہی سے بچایا جو شاید اس کے مُستحق نہ تھے۔ حاجت مَندوں[5] کی حاجت رَوا کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے........ (اور) اَپنے پَرائے خصُوصاً مُصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کر کے لوگوں کے

---

[1] صفحہ ۱۶۳ حالی
[2] صفحہ ۱۶۱ حالی
[3] صفحہ ۱۶۲ حالی
[4] صفحہ ۲۰۲ سر سیّد راس مسعود
[5] صفحہ ۱۶۳ حالی

کام نکالتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ (اُنھوں نے[1]) غریبوں اور مُستحقوں اور مفلوک الحال شُرفا کی ہمیشہ مدد کی۔ اکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ "دہنے ہاتھ سے یُوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو"۔ مولوی[2] صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ رُوپے پیسے کی بالکل محبّت نہیں تھی، بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہُوئے تھے۔ جب[3] روپیہ اُن کے پاس آتا تو اس کے دینے میں وُہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وُہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک یا چلتے پُرزے ہوتے اور یہی[4] وجہ ہے کہ اُن کے پاس کبھی روپیہ جمع نہ ہُوا اور خالی ہاتھ اس دُنیا سے کوچ کیا۔ مرحوم[5] کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص علمی کام یا تجارت کے لیے روپیہ طلب کرتا تو حتی[6] الامکان بڑی خوشی سے اُس کی مدد کرتے تھے۔ مرحوم[7] بہت بامُروت (بھی) تھے اگر کوئی شخص اُن سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وُہ پُوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دُوسری بار پھر آتا تو اس شرمندگی میں سب سے مُقدّم اُس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد براری میں کوشش کرتے۔

مرحوم[8] اپنے دوستوں کو مدد دینے اور اُن کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وُہ کسی قسم کی رکاوٹ یا مُشکل کی پروا نہیں کرتے تھے (اُس) کے لیے ہر وقت مُستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بیکسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں

۱۔ صفحہ ۳۳۷ سر سید احمد خاں ۲۔ صفحہ ۲۴ مولوی چراغ علی

۳۔ صفحہ ۱۰۴ مولوی سیّد علی بلگرامی ۴۔ صفحہ ۶۴ مولوی محمد عزیز مرزا

۵۔ صفحہ ۹۲ مولوی سیّد علی بلگرامی ۶۔ صفحہ ۸۸ مولوی سید علی بلگرامی

۷۔ صفحہ ۹۰ مولوی سیّد علی بلگرامی ۸۔ صفحہ ۱۰۵ مولوی سیّد علی بلگرامی

کی آس تھے۔ نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اِس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اِس درماندہ قوم کی دستگیری کرنا فرض ہے۔ لڑ جھگڑ کر، خوشامد سے، چاپلوسی سے، غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے۔ اِس طرح اُنھوں نے سینکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا۔[۱] اپنا کام نکال لینے کا بھی خوب ڈھب یاد تھا۔ دوسروں سے کام لینے کا اُنھیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔[۲] وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی اُن کا کام کرتے تھے۔ اپنے ملازموں اور ماتحتوں سے بھی اُن کا حُسنِ سلوک ایسا تھا کہ وہ اُن کی فرمائش کی تعمیل ایسی تن دہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے اُن کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔[۳] کام کرنے والوں کی قدر بھی کرتے تھے اور اُنھیں فائدہ پہنچانے کی تاک میں رہتے تھے اور بے دھڑک فائدہ پہنچاتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی خوب پھسلا کر کام لیتے تھے۔[۴] وہ اپنے دفتر کے ملازموں نیز نج کے نوکروں سے بڑی شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آتے تھے اور اُن کے عیوب سے چشم پوشی کرتے تھے۔[۵] وہ اِس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازموں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جائے۔ نوکروں کی مار پیٹ اور بدزبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بداخلاقی سمجھتے تھے۔[۶] نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے نہ کبھی کسی معاملے میں اُن سے باز پُرس کرتے اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہُوا کہ کسی نوکر نے اُن کی کوئی عزیز یا بیش قیمت چیز توڑ ڈالی، خفا ہونا تو درکنار اُنھوں نے پوچھا تک

۱۔ صفحہ ۲۰۱ سرسید راس مسعود ۲۔ صفحہ ۱۴۷ محسن الملک

۳۔ صفحہ ۲۰۱ سرسید راس مسعود ۴۔ صفحہ ۱۸۱ سرسید احمد خاں

۵۔ صفحہ ۳۴۲ سرسید احمد خاں ۶۔ صفحہ ۴۲ مولوی چراغ علی

نہیں کہ کیوں کر ٹوٹی اور کس نے توڑی۔

آدمی[1] کے پہچاننے میں اُنھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی مُلاقات اور بات چیت میں آدمی کو پُوری طرح بھانپ لیتے تھے۔ اُن کے ملنے والے بُرے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دُنیا نیکوں ہی کے لیے نہیں اس میں بدوں کا بھی حصّہ ہے اور شاید دُنیا کی بہت رونق اُنھیں کے دَم سے ہے۔ وُہ دونوں سے کام لیتے تھے۔

(مرحوم[2]) کی چال ڈھال، اُن کی ہَیئت، اُن کی طرزِ معاشرت اُن کا برتاؤ سب نرالے تھے...... وُہ اَپنے فن میں باکمال تھے...... وُہ غریبوں کے غم خوار اور دوستوں کے ہمدرد تھے۔ افسوس کہ (مُلک) ایک اَیسی ذات سے خالی ہو گیا جس کی نظیر اَب نہیں ہے لوگ اُنھیں بہت یاد کریں گے۔ اَحباب کے جلسے اُن کے بغیر سونے ہوں گے اور سب سے زیادہ اُن کے غریب دوست اُن کا ماتم کریں گے۔

(دُنیا) میں[3] جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دُوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے، وُہ اسی طرح سے رہے جیسے طُوفانِ موج خیز میں لائٹ ہاؤس........ وُہ اَپنے تمام سرکاری نیز (ذاتی) اُمور میں ہر قسم کے تعصّبات سے بَری تھے (اور) سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے اُن کی توجّہ اُور اُن کا دل کہیں اَور تھا ۔

پاک ہیں آلائشوں میں، بندشوں میں بے لگاؤ

رہتے ہیں دُنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ (حالیؔ)

لہ صفحہ ۱۴۷ محسن الملک ۲ہ صفحہ ۱۱۷ حکیم امتیاز الدین

۳ہ صفحہ ۹۹ مولوی چراغ علی

بے تعصّبی[1] کا وصف اُن ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

اُن کے[2] احباب میں ہندو اور عیسائی بھی تھے اور اُن سے اُن کا برتاؤ ویسے ہی خلوص اور محبّت کا تھا جیسا مسلمان دوستوں سے۔ اُنھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ لکھی جس سے دوسرے مذہب والوں کی دل آزاری ہو۔ اگرچہ بعض معاملات میں اُنھیں ہندو سر گروہوں سے اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کا اثر کبھی اُن کے اخلاق یا برتاؤ پر نہیں پڑا۔ کسی[3] مذہب و مِلّت سے اُنھیں خصومت یا پرخاش نہ تھی یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر زمانے[4] میں (وہ) گفتگو میں اکثر محاسن اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہّمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔

شیعہ[5] سُنّی کے جھگڑے کے متعلق اُن کی یہ رائے تھی کہ یہ پولیٹکل جھگڑا ہے (وہ اکثر اپنے رفیق حکیم اسرار احمد کریوی سے) ایک جرمن عالم کی کتاب (کا ذکر کرتے تھے) جس میں اُس نے اس پر خوب بحث کی ہے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں (کرائیں) لیکن افسوس کہ یہ خیال عمل میں نہ آیا۔ مرحوم[6] صحیح بخاری کے بڑے مدّاح اور قدر دان تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ مرحوم[7] مولوی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کو (بھی) بہت پسند کرتے تھے۔

اگرچہ[8] مرحوم تعصّب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و حمیّتِ قومی

---

[1] صفحہ ۱۶۴ حالی   [2] صفحہ ۲۵۰ سر سید احمد خاں

[3] صفحہ ۴۴ مولوی چراغ علی   [4] صفحہ ۲۷ نواب عماد الملک

[5] صفحہ ۹۶ مولوی سید علی بلگرامی   [6] صفحہ ۹۸ مولوی سید علی بلگرامی

[7] صفحہ ۸۷ مولوی سیّد علی بلگرامی   [8] صفحہ ۹۸ مولوی سیّد علی بلگرامی

اُن میں ضرور تھی اور اسلام و بانیٔ اسلام پر دل سے یقین رکھتے تھے، مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ وہ[۱] اُس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔ مرحوم[۲] ہندوستان کے مروّجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے نیز اُن لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدّدِ ازدواج کے حامی ہیں۔

(مرحوم[۳]) طالب علموں اور اہلِ علم کا بہت خیال کرتے تھے اور[۴] خواہ اُن کی دُنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہ ہوں، اُن سے بڑی مروّت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے، اُن کی صحبت سے خوش ہوتے تھے۔ وہ[۵] اہلِ علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور اُن کے لیے جو بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے اور[۶] جب اُن کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کرکے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے (اور اسی لیے[۷]) اُن کی مجلس میں عموماً علمی چرچے رہتے تھے ..... افسوس کہ اب کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہو سکے۔ جب[۸] کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یوں[۹] تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ اپنے لوگ ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بُخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے

---

۱ صفحہ ۴۴ مولوی چراغ علی ۲ صفحہ ۱۰۱ مولوی سیّد علی بلگرامی
۳ ″ ۸۸ مولوی سیّد علی بلگرامی ۴ ″ ۱۰۴ مولوی چراغ علی
۵ ″ ۴۲۵ نواب عماد الملک ۶ ″ ۳۹۸ نواب عماد الملک
۷ ″ ۶۳ مولوی محمد عزیز مرزا ۸ ″ ۱۷۵ حالی
۹ ″ ۸۶ مولوی سیّد علی بلگرامی

فیاض تھے ۔ وُہ صرف اَہلِ علم کی قدر و منزلت نہ کرتے تھے بلکہ اُن کے کام کو بھی وُقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ قدر دانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزری تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر، لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے ۔[1]

(مرحوم) جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر اُنھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔[2] (اُنھیں) اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیلِ علم کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں ۔ طلبہ میں وُہ خاص طور پر مقبول تھے ...... طالب علموں سے اُنھیں دلی ہمدردی تھی اور طرح طرح سے اُن کی مدد کرتے تھے، وُہ اپنی جیب سے نادار طلبہ کو وظیفے دیتے تھے ۔ سفارشیں کرتے تھے، نوکریاں دلواتے تھے، اُن کی مشکلوں میں کام آتے تھے، جائز معاملات میں اُن کی حمایت کرتے تھے، اُن کے وقار اور اُن کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے ۔ نام و نمود کی خاطر یا ٹالنے کی غرض سے نہیں بلکہ وُہ ان کے سچّے خیر اندیش اور بہی خواہ تھے اور طلبہ بھی اُن سے ویسی ہی محبت کرتے تھے اور اُن کی سعادت مندانہ اطاعت کرتے تھے ۔[3]

(مولوی عبدالحق) کا اصلی ذوق علمی و اَدبی تھا ۔ اُن کا مُطالعہ طالب علمی سے لے کر آخر تک جاری رہا ۔ مُطالعے میں بے حد شغف تھا، گویا یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا ......
تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ ہَواخوری میں تو اَلبتہ جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت

---

۱ صفحہ ۱۷۵ حالی ۲ صفحہ ۱۸۱ حالی

۳ ؍ ۱۸۴ سیّد علی بلگرامی ۴ ؍ ۱۹۶ سر سیّد راس مسعود

۵ ؍ ۱۹۷ سر سیّد راس مسعود ۶ ؍ ۲۷۸ سر سیّد احمد خاں

۷ ؍ ۲۷۰ سر سیّد احمد خاں ۸ ؍ ۱۱۳ خواجہ غلام الثقلین

۹ ؍ ۳۲-۲۱ مولوی چراغ علی

کام میں اور خاص کر مطالعۂ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا۔

تحقیق[1] و تفتیش کی چینک تھی وہ جس مضمون کا خیال کرتے اُس کی تہ تک پہنچتے اور اس کے مالۂ و ماعلیہ کے سُراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب (یا مضمون) کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے۔ اور لوگوں کو بھیج کر دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے ...... اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر اُنھوں نے قلم اُٹھایا دوسروں کے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے اُن کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور مواد فراہم کرنے کے لیے اُنھوں نے کس قدر محنت اور مشقت اُٹھائی ہے۔ وہ قدامت[2] پرست نہ تھے بلکہ اُنھوں نے بہت سی پُرانی رسموں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ ہر بات کو تحقیق اور عمل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے جو اس میں پوری اُترتی اُس پر عمل کرتے۔ تقلید کے مُطلق قائل نہ تھے۔ جدت اور نئی روشنی کے حامی تھے۔ وقار[3] اور متانت اُن پر ختم تھی استقلال میں پہاڑ تھے۔ آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کبھی نہ چُوکتے۔ مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

وہ[4] علم کی قدر کرتے تھے ...... خود بھی طالب علم تھے اور باوجود اس مرتبے پر پہنچنے کے اُن کے مزاج میں طالب علمانہ سادگی موجود تھی اور ادبی علمی گفتگو میں اُن کا اندازِ تخاطب بالکل ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہوتا ہے۔ اُس وقت وہ فرقِ مراتب کا

۱؎ صفحہ ۲۳ مولوی چراغ علی ۲؎ صفحہ ۲۲۹ سر سید احمد خاں

۳؎ صفحہ ۴۳ " " ۴؎ " ۴۰۷ نواب عماد الملک

بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

مرحوم کو کتابوں کا حد درجے شوق تھا۔ ہمیشہ[۲] عمدہ اور نادر الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ قلمی[۳] کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدر دانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں انمول کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے (مولوی عبدالحق) کتاب کے بڑے قدر دان تھے اور اس قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آگئی تو لیے بغیر نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ چنانچہ (انھوں[۴] نے) ایک نہایت عمدہ کتب خانہ چھوڑا ہے، جس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں۔ یہ ذخیرہ[۵] بہت بیش قدر اور نادر الوجود ہے اور تمام ہندوستان میں کہیں دوسری جگہ ایسا بیش بہا مجموعہ موجود نہیں۔ اور[۶] اس میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں جن پر اُن کے نشان یا نوٹ نہ ہوں۔

علم[۷] و ادب سے لگاؤ انھیں پہلے سے تھا۔ تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حساس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دنیا کے ادبی شاہکار بہت کم ایسے ہوں گے جو اُن کی نظر سے نہ گزرے ہوں۔ اس سے اُن کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہو گئی تھی جو اُن کے مضامین سے صاف ظاہر ہے۔ اس فاضل[۸] شخص کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ اُنھوں نے تمام عمر علم کے مطالعہ اور علم کی خدمت میں صرف کی۔ گو خود درویشوں کی طرح (زندگی) بسر کی مگر دوسروں کو ہر طرح فائدہ پہنچایا۔ ہمارے مدارس اور کالج کے اُستادوں اور طالب علموں کو اس بے ریا اور بے نفس شخص کی زندگی سے سبق حاصل

---

۱ صفحہ ۸۰ مولوی سید علی بلگرامی   ۲ صفحہ ۸۱ مولوی سید علی بلگرامی

۳ صفحہ ۳۹۲ نواب عماد الملک   ۴ صفحہ ۸۰ مولوی سید علی بلگرامی

۵ صفحہ ۸۱ مولوی سید علی بلگرامی   ۶ صفحہ ۳۲ مولوی چراغ علی

۷ صفحہ ۳۷۶ ڈاکٹر بجنوری   ۸ صفحہ ۲۰۰ درویش پروفیسر [illegible]

کرنا چاہیے۔ سچے عالم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اُن کی صحبت مُغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ آپنے زمانے کے پُرانے حالات (اگلے) بزرگوں کی خود داری، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور اُن کے توہّمات، اسراف اور شیخی کے قصّے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ اُن کا تخیّل[1] اس قدر بلند تھا کہ فہم وہاں پہنچتے پہنچتے لڑکھڑانے لگتا تھا شعر کا ذوق ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ مَیں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ اُن کا[3] مُطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں اُن کا منتخب کلام سُناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے سُن کر اُن کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلم بند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی ......

وہ خود ہمیشہ) اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض (مولوی عبدالحق) کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعے اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اُن کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ (شاید) اُن کی تالیفات سے کہیں زیادہ اُستوار اور دُور رس ہے۔

علم[4] کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔ آدمی[5] کو علم، دولت، آسائش و آرام، محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح

---

[1] صفحہ ۳۳۴ نواب عمادُالملک — [2] صفحہ ۱۱۶/۱۱۷ حکیم امتیاز الدین

[3] صفحہ ۳۳۴ نواب عماد الملک — [4] صفحہ ۳۵۵ ڈاکٹر محمد اقبال

[5] صفحہ ۳۳۲ نواب عماد الملک

ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اِس سے زندگی کے ہر شغل و شعبے میں ایک نرم اور سُہانی سی روشنی آجاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اوگھٹ گھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ (مولوی صاحب کا[1] ذوق بہت سلیم اور پاکیزہ تھا اور یہ ذوق علم و اَدب تک ہی نہ تھا......... زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں نظر آتا تھا۔

طبیعت[2] میں نفاست پسندی بہت تھی۔ صناعی کے دِل دادہ تھے۔ اچھی چیز کو دیکھ کر پھڑک جاتے تھے۔ بڑی صفائی اور سلیقے سے رہتے تھے۔ کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ خُوب کھاتے اور کھلاتے تھے۔ جب کوئی دعوت میں انگریزی کھانے کھلاتا تو بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے اور اِس کا بہت بُرا مانتے تھے۔ (مولوی[3] صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خُوبی اور اُس کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے (اور) کھانے کے[4] عیب و ہُنر کو بھی خوب پرکھتے تھے......... اُن کا باورچی (بشیر) تھا۔ یہ بھی (میرٹھ) کا تھا.... خُوب کھانا پکاتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں خاص مزہ تھا۔ رہنے[5]، سہنے، کھانے پینے، پوشاک غرض اُن کی ہر چیز میں نفاست پائی جاتی تھی۔

سادگی[6] و پُرکاری کمالِ صناعی ہے۔ اِس میں اَدب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور

۱؎ صفحہ ۲۵۵ ڈاکٹر محمد اقبال ۲؎ صفحہ ۲۰۳ سَر سید راس مسعود

۳؎ صفحہ ۲۲۴ نواب عماد الملک ۴؎ صفحہ ۱۴۹ محسن الملک

۵؎ صفحہ ۱۴۸ محسن الملک ۶؎ صفحہ ۸۷-۲۸۶ سَر سید احمد خاں

بے مزہ ہو گی ۔ سلاست کے ساتھ لطفِ بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے ۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو ۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور ہے ۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرزِ بیان کے ذریعے عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابلِ فہم اور دلکش ہو جاتا ہے ، جن کا علم ادھورا ہوتا ہے ، وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے ۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اُسے سمجھیں ، اُس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اُٹھائیں ، اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تضیع اوقات ہے (مولوی عبدالحق) کی تحریر اسی لیے مقبول ہوئی کہ وہ سادہ ، پُر اثر اور پُر خلوص تھی ۔ معمولی لکھے پڑھے شخص کی سمجھ میں بھی آتی اور اُس کے دل میں گھر کرتی ..... یہ اثر رنگین عبارت ، مقفیٰ مسجع جملوں تشبیہوں اور استعاروں کے ایچ پیچ سے پیدا نہیں ہو سکتا ۔ وہ اپنے مطلب کو سادہ لفظوں میں صاف صاف بیان کرنے کا بہت خیال رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) کا[1] یہ کمال تھا کہ کیسا ہی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہو ۔ وہ اس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اُترتا چلا جاتا تھا ۔ ضبط[2] اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے ۔ یہ دو خوبیاں اُن کے (یہاں) کامل طور پر پائی جاتی ہیں ۔ ورنہ جوش میں اگر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے ۔

اِس[3] خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا

---

[1] صفحہ ۲۸۸ سر سید احمد خان   [2] صفحہ ۱۷۲ حالی

[3] صفحہ ۱۶۶ حالی

ہے اُسے سنسکرت یا کم سے کم بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔ ایک بار[۱] جب اُردو لُغت کی ترتیب کا ذکر اُن سے آیا تو فرمانے لگے کہ "اُردو لُغات میں ہندی کے وُہ اَلفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلّف، کثرت سے داخل کرنے چاہئیں"۔ خُود اپنی (تحریر) میں وُہ ہندی اَلفاظ ایسی خُوبصورتی سے لکھ جاتے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وُہ اِسی موقع کے لیے وَضع ہُوئے تھے۔ اُنھوں نے بہت سے ایسے ہندی اَلفاظ اُردو اَدب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اُردو اَدیب یا شاعر نے کیا ہندی اَدیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے اَدب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی (مولوی عبدُالحق) سے سیکھے!

—— دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر اَدب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے! ایک بار[۲] فرمایا کہ:

"جو لوگ تذکیر و تانیث اور دِلّی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دُور اَز کار اَور فضول بحثوں اَور جھگڑوں میں پڑے ہوئے میں وُہ بڑی غلطی پر ہیں ..... زبان دلّی اور لکھنؤ کی تابع نہیں ہے بلکہ خیالات کی تابع ہے۔ کسی[۳] تحریر یا اَدب کی پُشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے، جن لوگوں کے خیالات رکیک ہیں اُن کی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی"

حقیقت[۴] یہ ہے کہ (مولوی عبدُالحق) جیسی طبیعت اور ذہانت اور جِدّت کے بہت

۱؎ صفحہ ۶۸-۱۶۷ حالی ۲؎ صفحہ ۸۷ مولوی سیّد علی بلگرامی

۳؎ صفحہ ۲۸۳ سر سیّد احمد خاں ۴؎ صفحہ ۸۷ مولوی سیّد علی بلگرامی

۵؎ صفحہ ۱۲۲ مولٰنا وحیدالدین سلیم

کم لوگ ہوتے ہیں۔ وُہ اعلیٰ درجے کے نثار تھے۔ اُن کی تحریر[۱] جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔ یہی حال اُن کی تمام تصانیف کا ہے۔ اُن[۲] کی تحریر میں بڑی قوّت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ بات کی تہ تک خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو اُستاد تھے......

وُہ الفاظ کے کینڈوں اور اُن کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور یہ لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں جن سے الفاظ ڈھلتے چلے آرہے ہیں۔ وُہ دوسرے ادیبوں کی طرح الفاظ اور محاورے سوچ سوچ کر اور ڈھونڈ کر نہیں لکھتے تھے اور نہ عبارت کے بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وُہ شروع سے آخر تک بلاتوقّف اپنے خیالات لکھتے چلے جاتے تھے اور پوری تحریر ایک مسلسل خوب صورت لڑی ہوتی تھی۔ مَیں اِس کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہُوں لیکن طوالت کے خوف سے معذور رہُوں۔

حقیقت[۳] یہ ہے کہ اُردو نثر میں جو انقلاب اور ترقّی ہم اس وقت دیکھتے ہیں اور اس میں جو وُسعت اور ادبی صلاحیت پائی جاتی ہے وُہ (اُن ہی) کا طفیل ہے......

متین، سادہ اور خوشگوار نثر لکھنا جو علمی[۴] اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوّت رکھتی ہے، (اُنھوں) نے سکھایا۔ اُردو[۵] زبان میں ابھی تک وُہ توانائی پیدا نہیں ہُوئی تھی جو ایک زبان کے ادب کے لیے لازم ہے۔ (مولوی عبدالحق) نے اِس کے قالب میں ایک نئی رُوح پھونکی

---

۱ صفحہ ۱۱۸ مولینا وحیدالدین سلیم ۲ صفحہ ۲۶ مولوی چراغ علی

۳ صفحہ ۱۲۲ مولینا وحیدالدین سلیم ۴ صفحہ ۲۹۳ سر سید احمد خاں

۵ صفحہ ۲۹۲ سر سید احمد خاں ۶ صفحہ ۱۰۴ نواب عماد الملک

۷ صفحہ ۲۸۵ سر سید احمد خاں

اور اُردو ادب میں ایک اِنقلاب پیدا کر دیا - اُنھوں نے زبان کو پستی سے نکالا - اندازِ بیان میں سادگی کے ساتھ قوّت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا - جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے - خود کتابیں لکھیں اور دُوسروں سے لکھوائیں -

اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اِس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وُہ نمونے کا کام دیں - بعض اوقات[له] جو کوئی اعلیٰ درجے کی کتاب چھپتی تو اُس کی تعریف کرتے اور دُوسروں کو بھی پڑھنے کا شوق دلاتے -

علمی[سه] و ادبی اعتبار سے اُردو زبان میں اُن کا بہت بڑا درجہ ہے - اُن کا ذوقِ ادب (بہت) اچھا تھا . . . . . اُن کی بے شمار تحریروں میں سے (اگر) ادبی نقطہ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو یہ انتخاب ہماری زبان و ادب کا بے مثل شاہکار ہوگا - یہ ادبی ذوق ہی تو تھا جس نے اُنھیں اُردو لغات اور اُردو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا - اُن کی تحریریں میں اکثر جگہ ادبی جواہر ریزے اور حُسنِ بیان کے چمکارے، ٹھیٹ زبان کے الفاظ و محاورے اور مزاح و ظرافت کی پھُلجھڑیاں نظر آئیں گی - (لیکن اُن[ٰه]) سے یہ توقع کرنا کہ اُن کی ہر تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہو، عبث ہے - (اُنھیں) ادائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اِس قدر خیال تھا کہ بعض وقت وُہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسنِ بیان کو قربان کر دیتے تھے - اِس وجہ سے (کہیں کہیں) اُن کی عبارت سُست اور پھُسپھُسی معلوم ہوتی ہے لیکن جو ادبی یا علمی تحریریں اور مضامین دل لگا کر لکھے ہیں وُہ حُسنِ بیان اور خیالات اور زبان کی

له صفحہ ۱۸۲ حالی — ٢ه صفحہ ۵۴ سر سیّد راس مسعود

سه صفحہ ۲۲-۲۲۳ سر سیّد احمد خاں — ٤ه صفحہ ۲۹۳-۲۹۲ سر سیّد احمد خاں

سلاست و فصاحت کے اعتبار سے اُردو ادب کے خزانے میں بے نظیر جواہر پارے ہیں۔ ان میں تمام اَدبی خوبیاں ہیں۔ تلمیحات بھی ہیں، تشبیہات و استعارات بھی ہیں، محاورات بھی ہیں، لُطفِ زبان بھی ہے مزاح اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے لیکن ہر چیز اپنے محل پر ہے اور تکلّف و تصنّع سے بَری۔

یوں تو عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر اُن کی پوری ہمت اور توجہ صرف ہوئی وہ (اُردو زبان کے پھیلاؤ) کا تھا۔[۱] اُردو کے عاشق تھے اور اسے برّصغیر کی قومی زبان خیال کرتے تھے[۲] اور اس کی ترقی و فروغ کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ اُردو کی حمایت میں (مولوی عبدالحق) نے کبھی کوتاہی نہیں کی جب کبھی اُردو پر آنچ آتے دیکھی تو اس کی حمایت کے لیے فوراً کمربستہ ہو گئے۔[۳] اُردو کی حمایت کو (وہ) اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اَہم قومی خدمت سمجھتے تھے اور اس معاملے میں اُنھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا۔[۴]

(یہ) بات اُن کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے..... (اُردو کو اُنھوں نے) اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا!... (اس کی) پرورش کی......اور مرتے دم تک کبھی اپنے سے جُدا نہ کیا۔ جو کچھ کماتے وہ اس کے (لیے) لاکر رکھ دیتے تھے۔[۵] اُنھوں نے اپنے پرچے (اُردو) کے ذریعے سے (زبان و اَدب) پر بڑے بڑے پُرزور مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جگہ جگہ جاکر لیکچر دیے اور تقریریں کیں۔[۶][۷]

۱۔ صفحہ ۲۴۶ سر سیّد احمد خاں — ۲۔ صفحہ ۳۵۶ ڈاکٹر محمد اقبال

۳۔ صفحہ ۲۰۳ سر سیّد احمد مسعود — ۴۔ صفحہ ۳۰۸ سر سیّد احمد خاں

۵۔ صفحہ ۲۲۳ سر سیّد احمد خاں — ۶۔ صفحہ ۲۲۳ میرن صاحب

۷۔ صفحہ ۱۱۰ خواجہ غلام الثقلین

اُنھیں کیا پڑی تھی کہ (اورنگ آباد) چھوڑ کر مارے مارے پھرتے لیکن محض (اُردو زبان) کی خاطر وُہ زمین کے گز بنے ہوئے تھے۔ وہ خود طرح طرح کی تکلیف اُٹھاتے لیکن اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیتے تھے .... اُنھیں ہر وقت اِس کا فکر رہتا تھا اور اُن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا.... (کہ) جس طرح بَن پڑے اس کی خدمت کریں۔ حق (پدری) شاید کسی نے اِس طرح اَدا کیا ہو۔ یہ وضع داری، یہ محبّت و شفقت اور ایثار اَب کہاں نظر آتا ہے۔ اَپنے کو مٹا کر (مقصد) کی خدمت کرنا ہی جوہرِ انسانیت ہے۔

ہر شخص[۱] میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اِس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اَور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے، نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں اِنسان، انسان بنتا ہے یہ سمجھو کُندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی، خُدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تُو نے کِتنی اور کِس کی پُوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وُہ کِسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وُہ پُوچھے گا تو یہ پُوچھے گا کہ مَیں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہنچانے اور اُس سے کام لینے میں تُو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو (عبدالحق) نیک بھی تھے اَور بڑے بھی!

اَفسوس[۳] کہ اُن کی زندگی کے آخری اَیّام اِنتہا درجے کی تلخی اور کرب و اَلم میں گزرے۔ (مرحوم کا) بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ حالت بہت رَدّی ہو چکی تھی.... حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی

۱؎ صفحہ ۲۲۴-۲۲۳ میرن صاحب ۲؎ صفحہ ۲۲-۲۳۱ نام دیو مالی

۳؎ صفحہ ۲۵۱ سر سیّد احمد خاں ۴؎ صفحہ ۵۱ مولوی چراغ علی

اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی ۔ وہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جاندار بچ نہیں سکتا، آن پہنچا اور وہ (۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو) ہمیشہ کے لیے اِس دُنیا سے رُخصت ہو گئے ۔۔۔

قلم اُن کا آخر دم تک نہ رُکا ۔ موت سے چند روز پہلے تک، جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو گئے، برابر لکھتے رہے ۔ ایسا جامع صفات اور جامع حیثیات، بے لوث و بے نفس، پُرعزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت ہمیں اس سے پہلے (ملا) اور نہ اِس کے بعد نصیب (ہوگا) ۔۔۔۔۔۔ اور آخر دم تک مردانہ وار، بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دُنیا سے چل بسا ۔ اُس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا، نہ مرنے کو ۔۔۔

ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں وہ ہر بڑے آدمی پر اِس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں، لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان جب ہوتا ہے، جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے ۔ (اُن) کی (رحلت) کے وقت کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمی کا ٹھٹھ باہر اور اندر لگا ہوا تھا ۔ سینکڑوں آدمی جن میں امیر، غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی تھے زار و قطار رو رہے تھے ۔ وہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا؟ مرحوم کی وفات پر تمام اُردو انگریزی اخبارات میں اظہارِ افسوس و ملال کیا گیا لیکن ہم یہاں بخوفِ طوالت صرف دو تحریروں کو نقل کرتے ہیں ایک (سابق صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں) کا اظہارِ افسوس جو اُنھوں نے "زیارت" سے کیا اور (مختلف رسائل و

---

۱ صفحہ ۳۵۲ سر سید احمد خاں ۲ صفحہ ۱۱۴ خواجہ غلام الثقلین

۳ صفحہ ۳۵۲ سر سید احمد خاں ۴ صفحہ ۳۵۲ سر سید احمد خاں

۵ صفحہ ۱۴۴ محسن الملک ۶ صفحہ ۵۲ مولوی چراغ علی

اخبارات میں) طبع اور شائع ہُوا۔ دُوسرا (ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری) کا الم نامہ جو اِس دردناک خبر (پر، اُنھوں نے (راقم کو) لکھا تھا۔ حقیقت میں دونوں تحریریں سچّی اور دل سے لکھی گئی ہیں:

○

[از جریدۂ "قومی زبان" تعزیتی پیغام فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سابق صدرِ پاکستان، جلد ۱۹، شمارہ نمبر ۱۲]

(مولوی عبدُالحق کی وفات ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ اُن کے اِنتقال سے ہم علم و اَدب کے ایک سچّے پرستار سے محرُوم ہو گئے ہیں۔ مرحوم اپنے مقصد کے حصُول کے لیے ایک مضبُوط اور غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے۔ اُن کی ذات، برصغیر پاک و ہند کے گزشتہ ایک سو سال کی اسلامی ثقافت کی مَظہر تھی۔ اُن کا ہمارے درمیان سے اُٹھ جانا ایک عظیم ادارے کے ختم ہو جانے کے برابر ہے۔

ذاتی طور پر اُن کے اِنتقال سے میں اپنے ایک قابلِ احترام دوست سے محرُوم ہو گیا ہُوں۔ اپنے مقصد سے اُنھیں جو لگاؤ تھا مَیں اُس سے ہمیشہ فیض حاصل کرتا رہا ہُوں۔ میری دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔")

○

[ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری کا اظہارِ غم اور خراجِ عقیدت از مکتوب محررہ یکم اپریل ۱۹۶۲ء]

(اُردو کا ذکر آتے ہی ہمارے دَور کے اَدب و شعر کی دُنیا میں آج کون ہے جو مَولوی عبدُالحق مرحوم کے نام پر اَدب و احترام کا خراج اَدا نہ کرے۔ ہم لوگ، مَیں اور میرے ہم عصر جو اُردو میں شعر و شاعری یا نثر نگاری کے دعویدار ہیں، سَب کے سَب بَابائے اُردو مَولوی عبدُالحق مغفور کے زیر بارِ احسان ہیں۔

وُہ اوّل سے آخر تک اس زبان کی ترویج و ترقی اور حفاظت کے لیے محوِ کار اُور برسرِ پیکار رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو (کبھی کی) نسیاً منسیاً نہ سہی کونوں کھدڑوں میں پناہ گزیں ہو چکی ہوتی اُور ہم سب بھانت بھانت کی بولیاں بولتے نظر آتے۔

ہم برّاعظم ہند کے باشندے، وُہ کوئی بھی ہوں، اِس قدر جلد اُردو اور ہندی کی وُہ معرکہ آرائی نہیں بھول سکتے جو اِس صدی کے آغاز سے مُسلسل جاری ہے اور مَیں سمجھتا ہُوں ابھی مُدّتوں جاری رہے گی۔ یہ مَعرکہ آرائی چند نُمایاں پہلو اختیار کر چکی ہے، اور مَیں وثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ اُردو نے (کسی محاذ پر) شکست نہیں کھائی۔ مَولوی عَبدُالحق صاحب اِس یورش کے مُقابل اُردو کی حفاظت کرنے والوں کے محاذ کے سپہ سالار تھے۔

آج پاکستان کی دو قومی زبانوں میں اُردو جو ایک زبان تسلیم کر لی گئی ہے یہ مَولوی عَبدُالحق ہی کی مَساعئِ جمیلہ اور اُیسی کارگزاری کا ثمر ہے جس کے لیے اِس مردِ حق پرست نے اُپنی جان تک دے دی، قُربان ہو گئے اُور ع

ھم یہاں کام آ گئے، آگے تمُھارا کام ہے

فرما کر جسمانی طور پر ہم سے رُخصت ہو گئے ہیں۔ لیکن الحمدُللہ اُردو کا پرچم آگے ہی آگے لہرا رہا ہے۔ مَولوی عَبدُالحق کی روح پھُول برسا رہی ہے، اُور ہم سب کو حوصلہ بخش رہی ہے اور آگے بڑھتے جانے کی تلقین فرما رہی ہے۔)

مَرحُوم کے اِنتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ اُن میں سے چند یہاں لکھی جاتی

لہ صفحہ ۵۶ مَولوی چراغ علی

رئیس سید (ہاشمی فرید آبادی صاحب) نے جو (عربی) صنائع میں تاریخ کی صنعت کو بہت پسند کرتے تھے، یہ تاریخ نکالی:

غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ

۱۳۸۱ھ

(حضرتِ رئیس امروہوی[1]) مدظلہ، العالی نے اسے نظم میں اِس طرح موزوں فرمایا ہے ؎

رحلتِ مولوئ محترم عبدُالحق
مرگِ تازہ پئے توسیعِ زبان اُردو
زندہ شُد، شیوۂ اسلافِ گرامی اَز وے
بود و اَست اَز صفِ سر سیدؒ و حالیؒ ہم او
ہاشمی، فکر چو فرمود پئے سالِ رئیس
ہاتفِ غیب صدا زد "غفر اللہ لہٗ"

۱۳۸۱ھ

(حضرتِ رئیس امروہوی[2]) نے خود بھی ایک قطعۂ (تاریخ) مرحوم کی وفات پر لکھا ہے، جس میں گویا مرحوم کے کام اور سیرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے، وُہ یہ ہے ؎

ہزار رنگ یہ دُنیائے نَو بہ نَو بدلے
مگر کہاں بدلِ مولوئ عبدُالحق
نقوشِ خدمتِ اُردو کہ ہیں جہاں افروز | نتائجِ عملِ مولوئ عبدُالحق
رفیقِ سیّد و حالی و اکبر و آزاد | وجودِ بے بدلِ مولوی عبدُالحق

---

[1] صفحہ ۵۶ مولوی چراغ علی [2] صفحہ ۵۶ مولوی چراغ علی

ہر اک محاذ پہ اُردو کا پاسباں ٹھہرا — جہادِ بر محل مولوی عبدالحق
ادارہ ہائے ترقی و خدمتِ ادبی — احساسِ بے خلل مولوی عبدالحق
فنونِ نثر میں نظم و نگارش و تحریر — قصیدۂ غزل مولوی عبدالحق
رئیس اہلِ عقیدت بھلا نہیں سکتے — عزیمت و عمل مولوی عبدالحق

غمِ اجل میں بھی سالِ اجل رہے در پیش
کہو: "غمِ اجل مولوی عبدالحق"

۱۳۸۱ھ

(پروفیسر حبیب اللہ صاحب غضنفر امروہوی) نے بھی، جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک زمانے تک (ناگپور، اور پھر اُردو کالج، کراچی) میں ملازم تھے اور اب (مرحوم ہو چکے) ہیں، ایک اچھا قطعۂ تاریخ لکھا ہے، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

اے غضنفر وصف کیا بابائے اُردو کے لکھوں — ذاتِ والا فخرِ پاکستان و صد عظمت نشان
صاحبِ نقد و نظر بھی، صاحبِ اسلوب بھی — آفتابِ نثرِ اُردو بالیقیں و بے گماں

تلخ ہا شیریں زندگی کا کس قدر انجام ہے
"شامِ غم" سے ہے سن ترحیلِ عبدالحق عیاں

۱۳۸۱ھ

(پروفیسر حامد حسن صاحب قادری)[2] نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں ایک سن عیسوی میں، دوسری ہجری نبوی میں (کہیں) جو یہ ہیں ؎

جُدا ہم سے بابائے اُردو ہوئے — ہم اب فیض سے اُن کے محروم ہیں
اُنھوں نے جو اُردو کی کیں خدمتیں — وہ سب قوم کے دل پہ مرقوم ہیں
بہت اُن کے احسان آئیں گے یاد — کہ اب محسن اُن کے سے معدوم ہیں

---

[1] صفحہ ۵۷ مولوی چراغ علی [2] صفحہ ۵۸ مولوی چراغ علی

یہ اللہ کے فضل سے ہے اُمید — کہ باغِ جناں میں وُہ مرحوم ہیں
لکھا قادری نے یہ سالِ وفات
کہ تھے "خادمِ قوم، مخدوم ہیں"

۱۹۶۱ء

مولوی عبدُالحق احساں شعار! — جن سے پاک و ہند دونوں فیض یاب ہیں
برگزیدہ محسنِ علم و ادب — پھر نہ کیوں "بابائے اُردو" ہو خطاب
خدمتِ اُردو میں دی جانِ عزیز — ایسی ہستی ہے جہاں میں انتخاب
نامِ عشّاقِ زباں میں کر گئے — بے نظیر و بے مثال ولاجواب
قادری اُن کی ہے تاریخِ وفات
"خادمِ قومی زباں، عزت مآب"!

۱۳۸۱ھ

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چیک پر دستخط کر دینے سے دُنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ہیں جنھیں اِتفاقاتِ زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ہیں محض نام و نمود کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں، لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزّت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے، مرحوم اِسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں سے تھے۔ باوجود اس لیاقت و (عظمت) کے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور اِنقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے، وُہ اُن کی آنچ سے بالکل محفوظ

---

[1] صفحہ ۱۰۸ خواجہ غلام الثقلین [2] صفحہ ۸-۷-۶ سیّد محمود

تھے ورنہ چاہتے تو اِس قدر شہرت اَور دولت حاصل کر سکتے تھے جو دُوسرے کی قدرت سے باہر ہے لیکن اُنھوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اَور مستانہ وار ٹھکرا کر چلے گئے۔

ملٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شہرت انسان کا فطری ضُعف ہے" اور حقیقت میں سچ بھی ہے۔ اس سے بچنا قریب قریب محال ہے لیکن بعض خُدا کے بندے جنھیں غیر معمولی دماغی قُوّت عطا ہُوئی ہے اور جن کا علم و فضل تبحّر کے رُتبے کو پہنچ گیا ہے اَیسے بھی ہیں کہ شہرت پر لات مار کر کُنج تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے اَور خیالات میں، خواہ بادِ ہَوائی کیوں نہ ہوں مگن ہیں۔ یا تو وُہ اِس ضُعف کی قوّت سے واقف نہیں کہ وُہ اِنسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وُہ اِسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر اُس کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے تیئں ایک غُلام یا بَیل گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبُور نہیں کرتے اَور چند بد مذاقوں کی ہاہا یا چند سمجھ داروں کی واہ وا کے لیے کاغذ کو سیاہ اور لب کو وَا کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بعینہٖ یہی حالت (اُن) کی تھی۔ (وُہ) کہا کرتے تھے: "کیا حاصل ہے شہرت سے؟ یہی نا کہ لوگ ہمارے نام سے واقف ہو جائیں، بالفرض اگر یہ ہُوا بھی تو اس سے کیا خُوشی ہو سکتی ہے اَور اگر یہی ہے تو کیوں نہیں ہزاروں لاکھوں کارڈ چھپوا کر اپنا کام اور نام درج کر کے تقسیم کر دیں کہ ایک دُنیا اُن دونوں سے واقف ہو جائے اور پھر پیٹ بھر کر خُوش ہو لیں"۔ . . . . . . اِس پاک نفس، عالی دماغ شخص کی حالت پر نظر ڈالنے سے یہ معلُوم ہوتا ہے کہ وُہ ایک پارسا صفت، دَرویش منش، صُوفی مَشرب اور بالغ نظر حکیم تھا۔ وُہ خواجہ حافظ کی غزلیں اَور قطعات پڑھتے اَور مزے لیتے۔ وُہ اپنی روزانہ ضرُوریات کی . . . . . کچھ پَرواہ نہ کرتے اَور بے تکلّف سادہ زندگی بسر کرتے جس میں نہ نئے فیشن کو دخل تھا اَور نہ پُرانی وضع کا زور چلتا تھا، مگر جس قدر وُہ اِن چیزوں سے بے پَروا تھے اُسی

قدر اَخلاص میں مُستثنیٰ تھے۔

اِنسان کی اَصلی فضیلت اَور برتری اُس کے اَخلاق (ہی) میں ہے۔ اَفراد ہوں یا اَقوام، اَخلاق کے زوال میں اُن کا زوال اَور اخلاق کی پابندی اور اُستواری میں اُن کی عظمت و وقعت ہے۔ (مولوی عبدُالحق) کی کامیابی کا راز اُن کے اَخلاقِ حمیدہ میں تھا۔ اَخلاق سے صِرف یہی مُراد نہیں کہ آدمی دُوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے۔ وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت رَوا کر دے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جیسا کہ اکثر تعریف کے طَور پر کہا جاتا ہے "مرنج و مرنجان" ہو —— اَخلاق کی حدُود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و اِستقلال، ضبط و تحمّل، جُرأت (خصُوصاً اَخلاقی جُرأت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رَواداری، اِنصاف، ہمدردی، اِیثار، اِنسان کے اَصل جوہر ہیں۔ اِن سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے، یعنی ذاتی اَغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اِنتہا یہ ہے کہ اَپنے آپ کو بھول جائے۔ اِنسانیت اِسی سے عبارت ہے ؎

می تواں قطبِ زماں شُد می تواں شُد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی می توانی شُد بہ جُز انساں شُدن

چیست اِنسانی تپیدن اَز تپِ ہمسائیگاں
اَز سمومِ نجد در باغِ عدن پژ مان شُدن

خوار دیدن خویش را اَز خوارئ ابنائے جنس
در شبستانِ تنگ دل اَز محنتِ زنداں شُدن

ل صفحہ ۳۶-۳۳۵ : سرسیّد احمد خاں

اَخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صُحبت سے میسّر آتے ہیں لیکن اِس جدید دَور اور جُدید تہذیب میں تعلیم تعلیم نہیں رہی۔ ہماری تعلیم گاہیں، دکانیں ہیں جن میں دساوری مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے یا ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمایشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اُس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے یا ذہن تک ہوتی ہے۔ اَخلاق، صرف و نحو منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں رٹائے جا سکتے۔ رہا صالح ماحول اور صُحبت — تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اَب ایک صُورت یہ ہے کہ اُن بزرگوں اور اُولوالعزم ہستیوں کے سوانحِ حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا مُلک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مُصیبتیں اور دُکھ سہے اور اَپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے۔ انکی قُربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اَذکار سُننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اَثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ (عبدُالحق) کی ہستی بھی ایسی ہی تھی!

اُن کی اَخلاقی جُرأت، آزادیِٔ خیال، رَواداری، اِنصاف پَسندی، بے تعصبی، فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مُسلمان سَب قائل تھے جس کام کو اُنھوں نے اَپنے ہاتھ میں لیا، اُسے کامل خُلوص اور تندہی سے اَنجام دیا۔ اَیسے وقت میں جب کہ بے لاگ اور بے ریا کام کرنے والوں کی شدید ضرورت ہے، جب کہ قومی ترقی کے ہر شعبے میں انسانوں کی تلاش ہے، جب کہ کام بہت ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صائبُ الرائے، مُعتدل مزاج، بے لاگ اور باخُلوص کام کرنے والے کا اُٹھ جانا غضب ہے!

لے صفحہ ۳۲۸ سَر سَید اَحمد خاں   لے صفحہ ۱۰۸ خواجہ غلام الثقلین

آدمیؔ کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ موتؔ اٹل ہے اور سب کو آنے والی ہے اور اس لیے کوئی ڈر کی چیز نہیں لیکن ایسی موت جو بے وقت ہو اور خصوصاً جب اس کا وار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی خوبیوں اور لیاقت میں عدیمؔ النظیر ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں۔ اور خاصؔ کر جب کہ یہ سانحہ ایسی قوم میں واقع ہو جہاں پہلے ہی سے قحطؔ الرجال ہو تو ایسی موت (واقعی) غضب ہے اور قیامت ہے اورؔ اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

ہمیںؔ جو اس قوم کے اعضا ہیں جس میں آج کل ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی بہت قدر کرنی چاہیے، جن کا ہونا ہمارے لیے فخر ہے اور جن کے سہارے اور مدد سے قوموں کو ایسی مدد ملتی ہے کہ ایک ایک اُن میں سے لاکھوں پر بھاری ہوتا ہے دنیا میں اکثر ہوا ہے کہ ایک سپاہی کی ہمت سے شکست کھاتے کھاتے فوج فتح پا گئی ہے، ڈوبتے ڈوبتے جہاز صرف ایک شخص کی دانشمندی سے پار اُتر گئے ہیں۔ یہ زمانہ ہمارے لیے بڑا کڑا زمانہ ہے ہمیں ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے ان کا ہونا ہمارے لیے نعمتِ عظمیٰ اور ان کا مرجانا ہمارے لیے ایک بلائے مبرم ہے . . . . . اُن کا غم مدتوںؔ ہمارے لیے تازہ رہے گا۔

مرحومؔ میں اس قدر محاسن اور خوبیاں جمع تھیں کہ آج باوجود تلاش کے کوئی اُن کا جانشین نہیں ملتا۔ لوگ اُنھیں زمانۂ دراز تک یاد رکھیں گے ——— انسانؔ نہیں رہتا لیکن

۱ے صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا ۲ے صفحہ ۱ سیّد محمود ۳ے صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا

۴ے صفحہ ۱ سیّد محمود ۵ے صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا ۶ے صفحہ ۱۲ سیّد محمود

۷ے صفحہ ۶۵ مولوی محمد عزیز مرزا ۸ے صفحہ ۵۱ مولوی چراغ علی

اُس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے ہٹائے نہیں مٹ سکتے، یہی اُس کی پونجی یہی اُس کی آل اولاد اور یہی اُس کی کمائی ہے ..... اولاد کس کے نہیں ہوتی اور کون جاندار ہے جو اِس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے اَدنیٰ اور حقیر جانور ہیں اُتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ چُنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ اُن کے چند گھنٹوں میں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں اور مرجاتے ہیں، لیکن اِنسان کا نام اُس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد، اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ — ہرگز نہیں، یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں بلکہ اُن کے کیریکٹر اور کام کی وجہ سے۔ اُن کا کیریکٹر اور کام خود ہمیں اُن کی یاد دلا رہا ہے۔[۱] اُن کی بھلائیاں، اُن کے کارنامے اور اُن کے احسانات، اُن کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔[۲] بس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دُنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔[۳] میں اُن کی موت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ اُن کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا۔ ہر علمی و ادبی کام میں ہم اُن کا نام سب سے پہلے شریک کرتے تھے۔ اب جو وہ نہیں ہیں [۴] مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوّت کم ہوگئی ہے۔

(مولوی عبدالحق) کی زندگی سے ہمیں بہت سے بے بہا سبق ملتے ہیں۔ اُن کا اپنے نصب العین پر آخر دم تک جمے رہنا، اس کے لیے ہر جائز ذریعے کو کام میں لانا، مخالف قوّتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا، محنت و مشقّت سے کبھی جی نہ چُرانا، دن رات کام میں لگے رہنا، تساہل اور کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دینا خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔[۵] ہم میں سے کتنے

---

۱ صفحہ ۶۵ مولوی محمد عزیز مرزا   ۲ صفحہ ۵۲ مولوی چراغ علی

۳ صفحہ ۱۲۱ مولینا وحیدالدین سلیم   ۴ صفحہ ۳۳۶ سر سیّد احمد خاں

۵ صفحہ ۱۲۲ مولینا وحیدالدین سلیم

ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں وقف کر دی ہو۔ اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم ہونا بہت دشوار ہے۔ مرحوم[1] ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے آپ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت، لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے، جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا چاہتا ہے، اس سے زیادہ کھوتا ہے ..... ان کی زندگی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ان کے کارنامے جوانانِ ملک کے لیے دلیلِ راہ کا کام دیں گے۔

یہ[2] عالی دماغ شخص سرزمینِ ہندوستان میں ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ ان پر جتنا فخر کریں بجا ہے اور ایسے وقت میں ہوئے جب کہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ غالباً[3] (مولوی عبدالحق) سے بڑھ کر کسی شخص نے کام کو اس طرح بے لاگ، بے تعلق اور بے لوث رہ کر سر انجام نہ دیا ہوگا۔ مرحوم[4] بوجہ اپنی اعلیٰ قابلیت، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے، ہماری قوم کے لیے مثل افراد میں سے ہیں۔ قومیں[5] ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے (عبدالحق) ہوتے!!

آج[6] ان کی موت پر ایک بڑے طبقے کو حقیقی رنج اور افسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو علم و ادب کا ایک ستون گر گیا۔ مرحوم[7] ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھے ان کے

لہ صفحہ ۱۳ مولوی چراغ علی	٢ه صفحہ ۲۴ مولوی چراغ علی
۳ه صفحہ ۲۵ مولوی چراغ علی	۴ه صفحہ ۲۹ مولوی چراغ علی
۵ه صفحہ ۱۳۸ گدڑی کا لال۔ نور خاں	٦ه صفحہ ۱۲۳ مولانا وحید الدین سلیم
۷ه صفحہ ۱۵۵ مولانا محمد علی	

رُفقاء اور اُن کے ہم عصر اُن کے سامنے پودنے تھے۔ (اُن[1]) کے اِنتقال سے اُردو ادب کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں۔ (اُن[2]) کا غم مُدّتوں ہمارے لیے تازہ رہے گا۔ اُن[3] کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں، جسے ہم کمال کہتے ہیں وُہ انھیں دونوں کا خانہ زاد ہے ——

وقت[4] ایک نعمت ہے اور خُدا کی دُوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی بھی قدر نہیں کرتا اور قدر اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وُہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دُنیا میں نہیں رہتا مگر اُس کے اعمال رہ جاتے ہیں لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو؟ جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں؟ اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے بہت مُشکل ہے کہ وُہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ تکمیل کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلقِ خُدا کو اُن سے فائدہ پہنچے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرحوم نے زمانۂ ملازمت اور باقی عمر میں بہت سے کام کیے لیکن دُنیا میں یادگار وُہی رہیں گے جن کا اثر دُوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا۔ اور یہ اُن کی تحریریں ہیں جو اُن کے قلم سے نکلیں، مُلک میں پھیلیں اور سُورج کی روشنی کی طرح ایک سرے سے دُوسرے سرے تک حیاتِ عالم میں اپنا مُفید کام کرتی رہیں گی اور مرحوم کی یاد کو اُن کے قدردانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

جو لوگ[5] یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، انھیں مولوی (عبدالحق مرحوم

---

[1] صفحہ ۱۱۸ مولٰنا وحید الدین سلیم   [2] صفحہ ۱۲ سیّد محمود

[3] صفحہ ۱۲۳ مولٰنا وحید الدین سلیم   [4] صفحہ ۱۰۷ مولوی سید علی بلگرامی

[5] صفحہ ۴۹ مولوی چراغ علی

کی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمینِ شور میں قبلہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ اُنھیں مولوی (عبدالحق) مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تُخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیے جس کے نتائج اَب تک بارآور ہیں اور جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ عزّت و حُرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا ؎

بارے دُنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو، یاں کہ بہت یاد رہو (میر)

وُہ[1] ہم میں نہیں رہے لیکن وُہ اپنی زندگی کا ایسا عظیمُ الشان کارنامہ چھوڑ گئے ہیں، جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اُن کی رائے میں کہیں کہیں غلطیاں بھی نظر آئیں گی، لیکن اُن کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مطلق شک و شُبہ کی گنجائش نہیں۔

اِس[2] میں شُبہ نہیں کہ انسان کی اصلی ترقی، دماغی قوّت پر منحصر ہے۔ دولت اُس کی محض معین ہے۔ اِنسان کی رُوح کو اگر ایک گاڑی تصوّر کیا جائے تو یہ جوڑی اُس کو کھینچنے والی ہے، لیکن اگر اُس کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہے تو یہ زمین تو کیا فلکُ الافلاک تک پہنچ جائے گی، لیکن خدانخواستہ اگر اُس کی باگ عقل کے ہاتھ سے چھین لی جائے تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ لیکن ہم اُن کی (آخر) زندگی سے متعلق اِس سے زیادہ نہیں کہیں گے کیونکہ اَب وُہ وہاں ہیں جہاں ہماری آواز نہیں پہنچ سکتی اور جو کچھ اُنھوں نے چھوڑا ہے وُہ ایسا کچھ ہے کہ اُس کی نظیر نہیں......

.....دُنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہُوا ہے نہ ہو گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی شخص میں ایسی خوبیاں

---

[1] صفحہ ۳۵۲ سر سیّد احمد خاں [2] صفحہ ۹-۱۱ سیّد محمود

ہوں جو عام طور پر دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور جن کا ہونا عجائبات اور نوادر میں سے ہے تو ایک ایسے شخص کا ہم میں سے اُٹھ جانا کیسے کچھ رنج اور کیسے کچھ اَلَم کا باعث نہ ہوگا - زمانے کی ترقی کبھی رُکتی نہیں اُس کا قدم ہمیشہ آگے پڑتا ہے مُمکن ہے ہم میں بہت سے لائق اور فاضل لوگ پیدا ہوں یہ سب کچھ ہوگا مگر (مولوی عبدُالحق) کہاں! ــــــ اُن کی باتیں فسانے کے طور پر رہ جائیں گی اور مُدّتوں اُن کا ذکر کرکے لوگ اُنھیں یاد کریں گے

دَورہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود

بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

. . . . . . وُہ ہم میں ایسے تھے جیسے پودوں میں دیو - افسوس ایسی نسلیں ہم میں سے مٹتی جاتی ہیں! عظیمُ الشان چیزیں گو وہ عملی لحاظ سے کیسی ہی ساکت اور صامت ہوں، لیکن صرف اُن کے وجود ہی سے دُنیا پر اِس قدر اَثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل نہیں ہو سکتا - تاروں بھری رات کو جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اَثر نہیں پڑتا؟ - جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بے چین موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے قلب پر عجیب کیفیت پیدا نہیں ہوتی؟ یہی حال اُن، وسیع نظر عالی دماغ لوگوں کا ہے، گو وُہ کچھ نہ کہیں لیکن اُن کا اثر نہایت پُرزور اور عجیب وغریب ہوتا ہے -

آخیر زمانے میں (اُن کے بعض بے تکلّف دوست اُنھیں "ایک شاندار انسانی کھنڈر" کہا کرتے تھے، لیکن کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے؟ ــــ کھنڈروں کی وقعت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ ــــ کیا ہم گوارا کر سکتے ہیں کہ کسی زمانے کی وُہ زندہ یادگاریں جو زندہ ثبوت ہیں ہماری تہذیب وشائستگی کا دُنیا سے نَسیاً منسیاً ہو جائیں ــــ؟ ایک جدید

اور نئی عمارت کے خراب ہو جانے اور اُس کے ڈھے جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا ایک کھنڈر کے ہٹ جانے کا۔ لیکن افسوس کہ وُہ عالی شان کھنڈر ہماری نظروں سے غائب ہو گیا اور مادرِ گیتی کا نہایت لائق فرزند زمین کا پیوند ہو گیا اور وہاں جگہ پائی جو اُس بزرگ کی سب سے مستحکم اور زندہ یادگار ہے جسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اسی دُھن میں دُنیا سے گزر گیا جہاں اب تک اُس کی رُوح پھر رہی ہو گی۔ یہاں[1] سیاح اور مسافر دور سے آئیں گے اور دو آنسو بہا جائیں گے!

مرحوم[2] ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔[3] اُن کی ذہانت[4] جودتِ طبع، وسیع نظری اور علم و فضل کو دیکھ کر دل میں عزت و احترام پیدا ہوتا تھا اور جب اُن کی شرافتِ نفس، عالی ظرفی، شفقت، دوستی اور خود داری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار اُن کی طرف کھنچتا تھا اور اُن سے محبت ہونے لگتی تھی۔ ایسے[5] لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب اُن سے ملتے تو اُن کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وُہ پرلے درجے کے نکتہ چین جو دُوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں، اُن کے ڈنک یہاں آ کر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وُہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت

---

[1] صفحہ ۱۱ سید محمود — [2] صفحہ ۱۸۳ حالی

[3] صفحہ ۲۷۹ ڈاکٹر بجنوری — [4] صفحہ ۸۴-۱۸۳ حالی

میں آسکتے ہیں ورنہ دُنیا میں پند و نصائح کی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں، کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دُنیا کبھی اچھّوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں، مگر افسوس کہ کوئی "عبدالحق" نہیں!!

(رسالہ نقوش، لاہور، مئی ۱۹۶۵ء)

ضمیمہ

بابائے اُردو کی ایک نادر تحریر

اگلے صفحات میں بابائے اُردو کی ایک نادر، غیر مطبوعہ قلمی تحریر مع عکس پیش کی جارہی ہے۔ یہ مولانا شبلی کے قیامِ حیدر آباد (۱۹۰۶ء) کے معروف علمی کارنامے "موازنۂ انیس و دبیر" پر مولوی عبدالحق کا ایک ریڈیائی تبصرہ ہے —— بابائے اُردو کی اصل قلمی تحریر، اُن کے دیگر آثار کے منجملہ، میرے ذاتی ذخیرۂ کُتب میں محفوظ ہے اور پہلی بار راقم الحروف کی توضیحات کے ساتھ منظرِ عام پر آرہی ہے۔

—— ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن

یہ عجیب بات ہے کہ ہماری تعلیمی علمی ادبی اصلاح کی ابتدا اُن لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو انگریزی زبان، مغربی خیالات و تمدن سے نا آشنا تھے۔ سرسید احمد خاں ان کے سالار اور محرک تھے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے نقاد تھے۔ انھوں نے تعلیم، نظامِ تعلیم، معاشرت، اخلاق، مذہب، سیاست، ادب غرض ہماری زندگی کے ہر شعبے پر آزادانہ اور بے باکانہ تنقیدیں کیں۔ یہ انھیں کا فیض تھا کہ ہماری زبان میں حالی، نذیر احمد آزاد اور شبلی جیسے زبردست ادیب اور نقاد پیدا ہوئے۔

حالی کا مرتبہ ان سب میں بلند ہے۔ وہ جدید شاعری، جدید تنقید، سوانح نویسی بلکہ جدید ادب کے بانی ہیں اور دوسرے مقلد۔ حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری ہمارے ادب میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی دوسری تصانیف اور مقالات میں بھی تنقید کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ہماری زبان پر خاصا چرچا شروع ہوگیا۔

اس کے بعد شبلی کا درجہ ہے۔ ان کی تنقیدی تالیفات میں شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ موازنے میں انھوں نے مرثیہ گوئی کی ابتدا کی تاریخ سی دی ہے۔ عربی فارسی مرثیہ گوئی کے ذکر کے بعد ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتدا کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس میں انھوں نے کئی عجیب تاریخی غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں "ولی نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی لیکن اس کے کلام میں مرثیہ کا پتا نہیں لگتا"۔ یہ غلط ہے۔ ولی نے ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی۔ جو مثنوی اس سے منسوب کی گئی ہے وہ ولی گجراتی کی نہیں بلکہ ولی ویلوری

یا روضۃ الشہدا

کی ہے۔ اس کا نام دہ مجلس ہے اور ولی گجراتی کی وفات کے
بہت بعد لکھی گئی۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "میر تقی صاحب
کے دیوان میں اگرچہ کوئی مرثیہ نہیں، لیکن انھوں نے بھی کہا ہے
ان کے ایک مرثیہ کا رد مرزا سودا نے لکھا ہے"۔ یہ دونوں
باتیں غلط ہیں۔ بے شک میر تقی کے مطبوعہ کلیات میں
مرثیے نہیں لیکن انھوں نے مرثیے کہے ہیں جو بعد کو اردو میں شائع
ہو چکے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ میر صاحب کے ایک مرثیے
کا رد مرزا سودا نے لکھا۔ جس مرثیے کا رد مرزا سودا نے لکھا ہے
وہ میر تقی میر کا نہیں بلکہ یہ ایک شخص میر محمد المتخلص بہ تقی
کا ہے۔ یہ غلطی اکثر تذکرہ نویسوں اور ادیبوں سے سرزد ہوئی
ہے۔ نام / تقی کے مشترک ہونے سے اسے میر تقی میر سمجھ
لیا گیا حالانکہ سودا کے قلمی نسخوں میں صاف طور سے تقی
استعمال ہوا ہے (تقی اس حکایت کو کوئی کیا کہہ گیا)۔
مولانا لکھتے ہیں "معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی، لیکن
اس قدر یقینی ہے کہ سودا اور میر سے پہلے مرثیہ کا رواج ہو چکا تھا"۔
سودا اور میر سے پہلے کیا مرثیہ کا رواج ولی سے بھی دو ڈھائی
صدی پہلے ہو چکا تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ نے بھی جس کا سنہ جلوس ۹۲۴ھ
ہے کئی نوحے لکھے ہیں۔ اس کے بعد کے زمانے میں بیسیوں بلکہ سینکڑوں
مرثیہ گو ہوئے جیسے میرزا، شاہی، قطبی، رضوان، اسد،
غواصی، اشرف، عاجز، اشعاری، غلامی، نفادی، عشقی، ہاشمی
نظر، دولس، رمزی، مشتاق وغیرہ وغیرہ۔

ان کا مقصد شہادت کربلا کا حال سنا کر رونا رلانا تھا۔
یہ قدیم مرثیے بہت سادہ ہوتے تھے اور نہ
اس قدر طویل ہوتے تھے جیسے کہ بعد کو میر و مرزا اور دوسرے
مرثیہ گویوں کے لکھے ہیں۔ ابتدائی مرثیوں میں کربلا کے شہادت کے
غم و الم کا بیان
واقعات اور مشہور روایات بیان کی جاتی تھیں۔ میر ضمیر اور
ان کے بعد مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیوں میں نئے نئے اضافے
اور جدتیں کی گئی ہیں۔ مثلاً رزمیہ بیان، سراپا، گھوڑے تلوار

بزم، رزم، اسلحہ کی کارستانیاں وغیرہ اور منظر نگاری مرثیہ کے خاص اجزا ہو گئے ہیں
آخر آخر میں ساقی نامے بھی جزو بن کر شامل ہو گئے ہیں۔ ان
مرثیوں میں مرثیت کا رنگ ہلکا پڑ گیا اور شاعری کا
پلہ بھاری ہو گیا۔ مرثیہ خوانی کی مجلسوں کی کیفیت قریب
قریب مشاعروں کی سی ہو گئی ہے۔ مرثیہ گو اپنا مرثیہ زیادہ تر اپنے کلام کی
داد کے لیے پڑھتا ہے اور اس لیے شعر و شاعری کے سارے کمالات
صرف کر دیتا ہے۔

مولانا کا یہ فرمانا کہ اردو میں رزمیہ شاعری نہ تھی، میر ضمیر
نے اس کی ابتدا کی اور میر انیس نے کمال کے درجے تک پہنچایا، صحیح نہیں۔
میر انیس کے مرثیوں کو رزمیہ شاعری کہنا درست ہے لیکن
ان میں ضمنی طور پر لڑائی کا ذکر آ جاتا ہے بعض بعض کے۔ قدیم اردو
میں صحیح رزمیہ شاعری موجود ہے مثلاً علی نامہ، جنگ نامہ، فتح نامہ
نصرتی کا، مرزا نعیم کا فتح نامہ ٹیپو سلطان، تاریخ سکندری یا فتح نامہ بہلول خان یا جنگ سیلانی
(محمد علی ۱۲۳۰ھ)، تاریخ سکندر یا فتح نامہ بہلول خان وغیرہ
متعدد رزمیہ مثنویاں ہیں۔ خصوصاً نصرتی کا علی نامہ
ایسی بے مثل رزمیہ مثنوی ہے کہ جس کا جواب اردو میں اب تک نہیں ہوا۔

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ جدید مرثیوں میں
شاعری پر زیادہ زور ہے اس لیے مولانا شبلی نے بھی مرثیوں کو اسی معیار
پر جانچا ہے۔ مثلاً فصاحت و بلاغت کی خوبیاں، کلام کی ترتیب، محاورے اور روزمرہ کا استعمال، استعارات و
تشبیہات، صنائع بدائع اور ان کی قسمیں مثلاً ایہام، مبالغہ،
حسن التعلیل، صنعت طباق، مراعات النظیر، لف و نشر، تفصیل
مبہم وغیرہ کی ~~تعریف~~ تعریفوں کی توضیح کرنے کے بعد
ہر ایک کی متعدد مثالیں میر انیس کے کلام سے پیش کی ہیں۔ مولانا
خود بہت اچھے شاعر ہیں اور اعلیٰ درجے کے صاحب ذوق ہیں۔
لطف سخن پر جان دیتے ہیں۔ موازنہ پڑھ کر شعر العجم وغیرہ میں
وہ تحقیق و تنقید کو چھوڑ کر شعر کے لطف کی طرف ڈھل

ملتے ہیں اور شعر کا مطلب، اس کی خوبیاں اور نکات بڑے پر لطف طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں تمام توضیح و تشریح اور انتخاب معانی و بیان کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اور شعر کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بہت قابل قدر اور مطالعہ کے لائق ہے۔ اس سے ہمارے شاعر کے خاص محمد حبیب پر بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ

یہ کلام کا ظاہر ہے۔ باطن یعنی موضوع کلام پر کم توجہ کی ہے۔ انھوں نے اس امر پر کافی بحث نہیں کی کہ جو روایات اور واقعات مرثیوں کے موضوع ہیں ~~[illegible]~~ تاریخی اعتبار سے ان کی کیا حقیقت ہے اور اس سے مرثیہ کی حیثیت پر باعتبار صنف شعر اور تعلق تاریخ کیا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ "بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔ مقتضائے حال کا موافق ہونا ایک جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع و اسباب آ جاتے ہیں"۔ بلاغت کی ~~[illegible]~~ تعریف میر انیس پر منطبق کر کے ~~[illegible]~~ فرماتے ہیں کہ "میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجے کی ہے لیکن یہ ان کے کمال کا اصلی معیار نہیں۔ ان کے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے"۔ اس پر پروفیسر کلیم الدین کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ اگر بلاغت کا مفہوم یہ ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو تو صرف میر انیس کا کلام نہیں بلکہ سارے مرثیے بلاغت سے معرا ثابت ہوں گے۔ مرثیوں میں اشخاص عربی ہیں، مقام کربلا ہے لیکن اس اقتضائے حال کا خیال کس مرثیہ گو کے دل میں نہیں گزرتا۔ مرثیہ گو لکھنؤ کی شادی و غمی کی رسمیں عرب پر منطبق کرتے ہیں اور وہ جوہی اور بیلے کے پھول عراق کے جنگل میں کھلا دیتے ہیں۔ وہ حضرت امام اور ان کے اہل حرم کے اصلی کیریکٹر پر بھی پردہ ڈال دیتے ہیں۔ ... واقعہ کربلا کے تصور اور اس کی جزئیات دونوں مقتضائے حال کے ناموافق ہیں"۔

اس کتاب میں ~~[illegible]~~ ~~[illegible]~~ میر انیس کا ~~[illegible]~~ بفضل سے

اردو کی تنقید

بیان کیے ہیں۔ آخر کے کچھ اوراق میں میر صاحب اور مرزا صاحب کا موازنہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فصاحت اور حسن بیان میں میر انیس کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ لیکن مولانا شبلی کا یہ کہنا کہ "فصاحت ان کے (مرزا دبیر کے) کلام کو چھو بھی نہیں گئی ... بلاغت نام کو نہیں"، ناانصافی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ایک دوسری جگہ خود ہی فرماتے ہیں "تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اتر جاتا ہے نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے"۔ یہ تضاد عجیب ہے۔

میر انیس کے کلام میں بھی صنعت مراعات النظیر، ایہام اور دوسرے لفظی صنائع نیز لفظی رعایت کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مبالغہ بھی ~~پایا جاتا ہے~~ اور بعض مقامات پر تو یہ مبالغہ غلو اور اغراق تک پہنچ گیا ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ مرزا صاحب کو نہیں پہنچتے اور بقول مولانا شبلی کے "مرزا صاحب کی قوت تخیل نہایت زبردست ہے اور وہ اکثر دور دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریف کا طائر وہم پرواز نہیں کر سکتا"۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب ان خوبیوں میں بڑھے ہوئے ہیں اور شکوہ الفاظ اور ... کہ ~~مرزا صاحب~~ ان کی خیال آفرینی، مضمون آفرینی، دقت پسندی اور کثرت مبالغہ صنائع و بدائع کا ازحد جواب نہیں۔ لیکن یہ جدتیں جب حد سے گزر جاتی ہیں تو فصاحت و بلاغت ہی سے نہیں گر جاتیں بلکہ بدنما لگتی اور مبتذل ہو جاتی ہیں اور یہ عیب مرزا صاحب کے ہاں اکثر پایا جاتا ہے۔

میر انیس کے کلام پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں مولانا نے موازنہ میں ان کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے طرفداروں کی طرف سے جو جوابات دیے گئے ہیں ان پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ اور اس میں مولانا نے بڑی آزادی اور انصاف سے کام لیا ہے۔ یہ سب اعتراضات لفظی ہیں۔ مرثیہ کے موضوع یا مضمون پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ یہ اعتراضات بیشتر مضامین کی غلطی، زبان کی اصلاح کا جائز ناجائز ہونا، حروف کا تقطیع سے گر جانے کے متعلق ہیں اور بیشتر صحیح ہیں۔ لیکن

~~[illegible] بعض اعتراض ایسے ہیں جو بھی لفظی ہیں لیکن~~

~~[illegible]~~

بعض الفاظ کے
نساخ نے تشبیہ کے متعلق بھی اعتراض کیا ہے اور
مولانا نے انھیں تسلیم کر لیا ہے لیکن ان میں سے بعض [illegible]
کچھ بیگموں کے زمانے میں قابل ہے۔ مثلاً اعتراض ہے "صفا" کی جگہ صاف ہونا چاہیے۔
"بت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے" ۔ صفا
صاف کرنے کے معنی میں اُس وقت تو استعمال ہوتا ہی تھا۔ اب بھی
عام طور پر خصوصاً عورتوں کی بول چال میں مروج ہے۔ جان صاحب کا شعر ہے
"آئینہ جس شفاف اپنے کیوں گھر لایا
کرتا ہے صفا روز جلوہ خانے کو لوٹا" ۔ اعتراض ہے کہ پروانگی
برخاست کی واعظوں کو پروانگی ہوئی" ۔ امانت لکھتے ہیں
غلط ہے۔ پروانگی اب بھی مستعمل ہے اور اس معنی میں بھی ایسا ہی مستعمل ہے اور غلط نہیں۔
"پتنگ کو ہے پروانگی محفل میں آنے کی" ۔ اب بھی کوئی کسی کے آنے کی اس
اعتراض ہے کہ واو عطف فارسی اور اردو کے لفظ کے درمیان غلط ہے
نہیں آتا۔ آج کل غلط ہے لیکن اس زمانے میں اس کا استعمال جائز سمجھا جاتا۔ پیش نظر
سر سید احمد خاں کے زمانے تک مروج ہے اور خود انھوں نے بھی اس کا استعمال جاری رکھا
اس زمانے کو بیتے ہیں خوش پوشاک ہیں" ۔ خوش بجائے خوش غلط ہے لیکن
بہرحال کے زمانے میں استعمال جائز تھا۔ آئن کا مروج ۔ والدہ کے ہاتھ
کیے گئے" ۔ بیگمات کی زبان پر آب ہے ۔ کیا ہے لیکن وہ بھی کلام کا ظاہر ہے
بعض مشہور بیگموں کی محفل بھی اس سے پاک ہے ۔ لفظی رعایت کا عیب
تعلق رکھتی ہیں مثلاً دو مصرعوں کا نہ ربط ہونا ۔ کلام کا بالکل بے اثر ہونا
کلام کا ادھورا اور بے اثر ہونا وغیرہ ۔
اعتراض کیا گیا ہے ۔
مولانا حالی کا مقدمہ شعر و شاعری کے بعد تنقید کا ۔۔۔ کی تنقید پر اسلوب
شبلی کی یہ کتاب ہے ۔ جو ہمارے مشرقی شاعری کے نقطہ نظر سے اہم کے
محاسن و عیوب کے سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے ۔ اس لیے اس کا مطالعہ خاص
ہمارے جدید ادیبوں کے لیے ضرور باعث انداز ہوگا ۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہماری تعلیمی، علمی، اَدبی اصلاح کی ابتدا، اُن لوگوں کے ہاتھوں ہُوئی جو انگریزی زبان، مغربی خیالات و تمدّن سے نا آشنا تھے۔ سَر سید احمد خاں ان کے سالار اور محرّک تھے۔ وُہ اَپنے عہد کے بہت بڑے نقّاد تھے۔ اُنھوں نے تعلیم، نظامِ تعلیم، معاشرت، اَخلاق، مذہب، سیاست، اَدب، غرض ہماری زندگی کے ہر شعبے پہ آزادانہ اور بے باکانہ تنقیدیں کیں۔ یہ اُنھیں کا فیض تھا کہ ہماری زبان میں حالی، نذیر احمد، آزاد، شبلی جیسے زبردست اَدیب اور نقّاد پیدا ہُوئے۔ حالی کا مرتبہ ان سب میں بلند ہے۔ وُہ جدید شاعری، جدید تنقید، سوانح نویسی بلکہ جدید اَدب کے بانی ہیں اور دُوسرے مقلّد۔

حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ اُن کا مُقدمۂ شعر و شاعری ہمارے اَدب میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی دوسری تصانیف اور مقالات میں بھی تنقید کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ہماری زبان میں [تنقید کا] خاصا چرچا شروع ہوگیا۔

اس کے بعد شبلی کا درجہ ہے۔ اُن کی تنقیدی تالیفات میں شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ موازنے میں اُنھوں نے ابتدا مرثیہ گوئی کی تاریخ سے کی ہے۔ عربی فارسی مرثیہ گوئی کے ذکر کے بعد وُہ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتدا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں اُنھوں نے کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً وُہ لکھتے ہیں:

> ولی نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی لیکن
> اُس کے کلام میں مرثیے کا پتا نہیں لگتا[1]،،

یہ غلط ہے۔ ولی نے ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی۔ جو مثنوی اُس سے منسوب کی گئی ہے وہ ولی گجراتی کی نہیں بلکہ میر ولی فیاض ویلوری کی ہے۔ اس کا نام دہ مجلس یا روضۃ الشہدا ہے اور ولی گجراتی کی وفات کے بہت بعد لکھی گئی[2]۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

"میر تقی صاحب کے دیوان میں اگرچہ کوئی مرثیہ نہیں، لیکن انھوں نے بھی کہا ہے۔ اُن کے ایک مرثیے کا رَد مرزا سودا نے لکھا ہے [۳۷]"

یہ دونوں باتیں غلط ہیں ۔ بے شک میر تقی کے مطبوعہ کلیات میں مرثیے نہیں، لیکن انھوں نے مرثیے کہے ہیں جو رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکے ہیں ۔ یہ بھی غلط ہے کہ میر صاحب کے ایک مرثیے کا رَد مرزا سودا نے لکھا، جس مرثیے کا رَد مرزا سودا نے لکھا ہے، وُہ میر تقی میر کا نہیں، بلکہ یہ ایک شخص میر محمد المتخلص بہ تقی کا ہے ۔ یہ غلطی اکثر تذکرہ نویسوں اور ادیبوں سے سرزد ہوئی ہے ۔ نام میں تقی کے مشترک جزء سے، اُسے میر تقی میر سمجھ لیا گیا' حالانکہ سودا کے قلمی نسخوں میں صاف طور سے تقی استعمال ہُوا ہے : تقی اِس حکایت کو کوئی کیا کہے گا

مولانا لکھتے ہیں :

"معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی، لیکن اِس قدر یقینی ہے کہ سودا اور میر سے پہلے مرثیے کا رواج ہو چکا تھا [۳۸]"

سودا اور میر سے پہلے کیا، مرثیے کا رواج ولی سے بھی دو اڑھائی صدی پہلے ہو چکا تھا۔ سُلطان قلی قطب شاہ نے بھی جس کا سنہ جلوس ۹۲۴ھ [۱۵۱۸ء] ہے، کئی نوحے لکھے ہیں۔ اُس کے بعد کے زمانے میں بیسیوں بلکہ سینکڑوں مرثیہ گو شاعر ہوئے، مثلاً: میرزا، شاہی، قطبی، رضوان، احسان، غواصی، اشرف، عاجز، اعتقادی، غلامی، عشقی، ہاشمی، منظہر، داس، رمزی، مشتاق وغیرہ وغیرہ [۳۹]

یہ قدیم مرثیے بہت سادہ مگر پُردرد ہوتے تھے ۔ اُن کا مقصد شہادتِ کربلا کا حال سُنا کر رونا رُلانا تھا۔ اور نہ وُہ اِس قدر طویل ہوتے تھے جیسے کہ میر و مرزا اور دوسرے مرثیہ گویوں کے مرثیے ۔ ابتدائی مرثیوں میں غم و الم کے لیے شہادت کے واقعات اور مشہور مُروّجہ روایات

بیان کی جاتی تھیں۔ میر ضمیر اور اُن کے بعد مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیوں میں نئے نئے اِضافے اور جدتیں کی گئیں۔ مثلاً رزمیہ بیان، سراپا، گھوڑے تلوار، نیزے وغیرہ اسلحے کی کارستانیاں اور منظر نگاری وغیرہ مرثیے کے خاص اجزا ہو گئے ہیں۔ آخر آخر میں ساقی نامے جیسی چیزیں بھی شامل ہو گئیں۔ ان مرثیوں میں مرثیت کا رنگ ہلکا پڑ گیا اور شاعری کا پلّہ بھاری ہو گیا۔ مرثیہ خوانی کی مجلسوں کی کیفیت قریب قریب مُشاعروں کی سی ہو گئی ہے۔ مرثیہ گو اپنا مرثیہ زیادہ تر اپنے کلام کی داد کے لیے پڑھتا ہے۔ اور اس لیے شعر و شاعری کے سارے کمالات صرف کر دیتا ہے۔

مولانا کا یہ فرمانا کہ اُردو میں رزمیہ شاعری نہ تھی، میر ضمیر نے اس کی ابتدا کی اور میر انیس نے کمال کے درجے تک پہنچایا، صحیح نہیں۔ میر انیس کے مرثیوں کو رزمیہ شاعری کہنا دُرست نہیں کہ ان میں کہیں کہیں ضمنی طور پر لڑائی کے بعض پہلوؤں کا ذکر آ جاتا ہے۔ قدیم اُردو میں صحیح رزمیہ شاعری موجود ہے۔ مثلاً نصرتی کا علی نامہ ۱۰۶۸ھ، حسن شوقی کا فتح نامہ نظام شاہ[۹]، مرزا مُقیم کا فتح نامۂ بکھیری[۱۰] (عہد سلطان محمّد عادل شاہ)، نصرتی کی تاریخ سکندری[۱۱] یا فتح خاں بہلول خاں بالشکر سیواجی ۱۰۸۳ھ [۱۶۷۲ء] وغیرہ مُتعدد رزمیہ مثنویاں ہیں۔ خصوصاً نصرتی کا علی نامہ ایسی بے مثل رزمیہ مثنوی ہے کہ جس کا جواب، اُردو میں اب تک نہیں ہوا۔

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ جدید مرثیوں میں شاعری پر زیادہ زور ہے، اس لیے مولانا شبلی نے بھی مرثیوں کو اسی معیار پر جانچا ہے۔ مثلاً فصاحت و بلاغت کی خوبیاں، کلام کی ترتیب، محاورے اور روزمرّہ کے استعمال، استعارات و تشبیہات، صنائع بدائع اور ان کی قسمیں مثلاً: ایہام، مُبالغہ، حسن التعلیل، صنعتِ طباق، مراعات النظیر، لف و نشر، تفصیلی، مُہملہ وغیرہ کی تعریفوں کی توضیح کرنے کے بعد ہر ایک کی مُتعدد مثالیں میر انیس کے

کلام سے پیش کی ہیں۔ مولانا خود بہت اچھے شاعر ہیں اور اعلا درجے کے صاحبِ ذوق ہیں۔ لطفِ سخن پر جان دیتے ہیں۔ موازنے نیز شعر العجم وغیرہ میں وہ تحقیق وتنقید کو چھوڑ کر شعر کے لطف کی طرف ڈھل جاتے ہیں۔ اور شعر کا مطلب، اس کی خوبیاں اور نکات بڑے پر لطف طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ یہ تمام توضیح وتشریح اور انتخاب معانی وبیان کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اِس اعتبار سے یہ کتاب بہت قابلِ قدر اور مطالعے کے لائق ہے۔ اس سے ہماری شاعری کے محاسن وعیوب میں بصیرت حاصل ہوتی ہے اور شعر کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے۔

یہ کلام کا ظاہر ہے۔ باطن یعنی موضوعِ کلام پر کم توجہ کی ہے۔ انھوں نے اِس امر پر کافی بحث نہیں کی کہ جو روایات اور واقعات، مرثیوں کے موضوع ہیں، تاریخی اعتبار سے اُن کی کیا حقیقت ہے، اور اِس سے مرثیے کی حیثیت پر باعتبارِ صنفِ شعر اور تعلقِ تاریخ کیا اثر پڑتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

"بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔ مقتضائے حال کے موافق ہونا، ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع واسباب [اسالیب] آجاتے ہیں۔[12]"

بلاغت کی اِس تعریف کو میر انیس پر مطابق کر کے فرماتے ہیں کہ:

"میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغتِ الفاظ بھی اگرچہ اِنتہا درجے کی ہے، لیکن یہ اُن کے کمال کا اصل معیار نہیں۔ اُن کے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے۔[13]"

اِس پر پروفیسر کلیم الدین کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ:

"اگر بلاغت کا مفہوم یہ ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو تو صرف میر انیس ہی کا کلام نہیں بلکہ سارے مرثیے بلاغت سے مُعرّا ثابت ہوں گے۔ مرثیوں میں اشخاص عربی ہیں، مقام کربلا ہے، لیکن اس اقتضائے حال کا خیال کسی مرثیہ گو کے دل میں نہیں گزرتا۔ مرثیہ گو لکھنؤ کی شادی و غمی کے رسوم عرب پر منطبق کرتے ہیں اور وہ جوہی اور بیلے کے پھول عراق کے جنگلوں میں بچھا دیتے ہیں۔ وہ حضرت امام اور اُن کے اہل حرم کے اصل کیریکٹر پر بھی پردہ ڈال دیتے ہیں..... واقعہ کربلا کے تصوّر اور اس کی جزئیات دونوں مقتضائے حال کے ناموافق ہیں[14]۔"

اس کتاب میں (مولانا نے) میر انیس کے محاسن بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ آخر کے کچھ اوراق میں میر صاحب اور مرزا صاحب کا موازنہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فصاحت اور حُسنِ بیان میں میر انیس کا درجہ بڑھا ہوا ہے لیکن مولانا شبلی کا یہ کہنا کہ:

"فصاحت اُن کے (مرزا دبیر کے) کلام کو چھو بھی نہیں گئی..... بلاغت نام کو نہیں[15]"،

ناانصافی ہے۔ لُطف یہ ہے کہ ایک دوسری جگہ خود ہی فرماتے ہیں:

"تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں اُن کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اُتر جاتا ہے، نہایت بلند رُتبہ ہو جاتا ہے[16]"،

تضاد عجیب ہے۔

میر انیس کے کلام میں بھی صنعت مراعات النظیر، ایہام اور دوسرے صنائع، نیز لفظی رعایت کی کافی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مُبالغے کا بھی زور ہے اور بعض مقامات پر تو مُبالغہ غلو اور اغراق تک پہنچ گیا ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ مرزا صاحب کو نہیں پہنچتے اور بقول مولانا شبلی کے:

"مرزا صاحب کی قوّتِ متخیلہ نہایت زبردست ہے اور وہ اِس قدر دُور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک اُن کے حریفوں کا طائرِ وہم پرواز نہیں کر سکتا[۱۸]"

اِس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کے مرثیوں میں بڑی دھوم دھام اور شکوہ اور شوکت ہے۔ اُن کی خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی اور شدتِ مبالغہ، صنائع و بدائع کی کثرت، کا جواب نہیں لیکن یہ جدّتیں جب حد سے گزر جاتی ہیں تو فصاحت و بلاغت ہی سے نہیں گر جاتیں بلکہ بدنما، پست اور مبتذل ہو جاتی ہیں اور یہ عیب مرزا صاحب کے ہاں اکثر پایا جاتا ہے۔

میر انیس کے کلام پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، مولانا نے موازنہ میں اس کا بھی ذکر کیا ہے اور اُن کے مدّاحوں کی طرف سے جو جوابات دیے گئے ہیں، اُن پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس میں مولانا نے بڑی آزادی اور انصاف سے کام لیا ہے۔ یہ سب اعتراضات لفظی ہیں۔ یہ اعتراضات قافیوں کی غلطی، نون کے اعلان کے جائز ناجائز ہونے، حروف کا تقطیع سے گر جانے کے متعلق ہیں اور صحیح ہیں، لیکن مرثیے کے موضوع یا مضمون پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

نسّاخ نے بعض الفاظ کی صحت کے متعلق بھی اعتراض کیا ہے اور مولانا نے انھیں تسلیم کر لیا ہے، لیکن ہمیں ان میں سے بعض غلطیوں کے ماننے میں تأمل ہے۔ مثلاً:

بُت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے

اعتراض ہے صفا کی جگہ صاف ہونا چاہیے[۱۹]۔ صفا صاف کرنے کے معنی میں اُس وقت تو استعمال ہوتا ہی تھا، اب بھی عام طور پر خصوصاً عورتوں کی بول چال میں مروّج ہے۔ جان صاحب

کا شعر ہے:

کرتا ہے صفا روز جلوہ خانے کو نورا
آئینہ میں شفاف رہے کیوں نہ گھر اپنا

○

"برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی"

اعتراض یہ ہے کہ پروانگی غلط ہے[۲۰] - پروانگی اِن ہی معنی میں اب بھی مستعمل ہے اور غلط نہیں۔ امانت لکھتے ہیں:

پتنگے کو نہیں پروانگی محفل میں آنے کی

○

ایک مصرعہ ہے:

"ایسا بھی کوئی بیکس و بے آس نہ ہوگا"

اعتراض ہے کہ یہ واو عطف فارسی اور اُردو کے لفظ کے درمیان غلط ہے[۲۱]۔ بے شک آج کل غلط ہے، لیکن اُس زمانے میں اس کا استعمال جائز سمجھا جاتا تھا چنانچہ سر سید احمد خاں کے زمانے تک مُروّج رہا اور خود اُنھوں نے بھی اس کا استعمال جائز رکھا۔

○

"اِس مژدہ کو سُنتے ہی خوشی ہوگئیں شیریں"

خوشی، بجائے خوشش غلط ہے[۲۲]، لیکن میر صاحب کے زمانے میں یہ استعمال جائز تھا آتش کا مصرع:

خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

بیگمات کی زبان پر اب تک ہے۔

بعض معنوی غلطیوں کی طرف بھی اِشارہ کیا ہے، لیکن وُہ بھی کلام کے ظاہر سے تعلّق رکھتی ہیں، مثلاً دو مصرعوں کا بے ربط ہونا[۲۳]، لفظی رعایت کی وجہ سے کلام کا اوچھا اور بے اثر ہونا[۲۴] وغیرہ۔ کلام کے باطن پر شاذ ہی کوئی اعتراض کیا گیا ہے۔

مولانا حالی کے مُقدمۂ شعر و شاعری کے بعد تنقید پر مولانا شبلی کی یہ کتاب ہے، جو ہماری مشرقی شاعری کے نُقطۂ نظر سے اس کے محاسن و عیوب کے سمجھنے میں بہت مدد دے گی۔ اس لیے اس کا مُطالعہ خاص ہمارے جدید اَدیبوں کے لیے ضرور بصیرت افروز ہوگا۔

توضیحات

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

لہ دیکھیے موازنۂ انیس و دبیر، شبلی، مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۲ء ص ۱۸

لہ پُر گو شاعر میر ولی فیاض ویلوردی (علاف آرکاٹ، مدراس) ۱۷۵۱ء تک بقیدِ حیات تھے اُن کی مثنوی روضۃ الشہدا جو دہ مجلس بھی کہلاتی ہے ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء میں لکھی گئی یہ مُلّا حسین واعظ کی فارسی مثنوی کا اُردو ترجمہ ہے۔

[تاریخِ اَدبیاتِ مُسلمانانِ پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۱ء چھٹی جلد، ص ۵۶۱]

بابائے اُردو، ولی گجراتی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء مانتے ہیں (رسالہ اُردو جنوری ۱۹۳۴ء ص ۱۹۴-۱۹۷) اِسی لیے اُنہوں نے لکھا ہے کہ دہ مجلس، "ولی گجراتی کی وفات کے بہت بعد لکھی گئی۔" لیکن ولی کا سالِ وفات تحقیقِ مزید کے

بعد، اب ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء کے بعد اور ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء سے پہلے متعیّن ہُوا ہے۔
دیکھیے: ولی کا سالِ وفات از: ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ: جشن نامہ اورینٹل کالج، لاہور دسمبر ۱۹۷۲ء، ص ۶۷

۳ے موازنۂ انیس و دبیر، شبلی، ایضاً، ص ۱۸

۴ے دیکھیے: میر تقی میر کے سلام اور مرثیے، رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۴

۵ے موازنۂ انیس و دبیر، شبلی، ص ۱۸

۶ے تفصیل کے لیے دیکھیے: دکن میں اُردو، نصیرُ الدّین ہاشمی
اُردو شہ پارے جلد اوّل ۱۹۲۹ء ڈاکٹر محی الدّین قادری

۷ے موازنۂ انیس و دبیر، شبلی، ص ۲۱۳

۸ے ملکُ الشعرائے بیجاپور نصرتی (وفات: ۱۶۷۵ء) کی مشہور رزمیہ مثنوی "علی نامہ" (اشعار: ۴۵۱۹) ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء کی تصنیف نہیں، اِس کا سالِ تالیف ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء ہے۔ اِس مثنوی میں اُن مُہمّات کا ذکر ہے جو علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ء — ۱۶۷۲ء) کو سیواجی کی بڑھتی ہوئی قوّت کو روکنے اور مُغلوں کی فوجی طاقت کی مدافعت میں پیش آئی تھیں۔ انجمن ترقّیٔ اُردو پاکستان کے کتاب خانے میں "علی نامہ" کے پانچ مخطوطے محفوظ ہیں۔ دیکھیے: مخطوطاتِ انجمن ترقّیٔ اُردو، (اُردو) جلد اوّل، ۱۹۶۵ء ص ۲۷۱

۹ے حسن شوقی (ولادت ۹۴۸ھ/۱۵۴۱ء) کا "فتح نامہ نظام شاہ" (اشعار: ۶۲۰) دکن کی جنگ تالیکوٹ ۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء کی فتح پر مُرتب ہُوا۔
[ڈاکٹر جمیل جالبی، مقدمہ، دیوان حسن شوقی، ۱۹۷۱ء ص ۱۴]

۱۰ے فتح نامہ بکھیری (ابیات: ۲۲۴) اُس مُقیمی کی مثنوی ہے جس نے ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۷ء
اور ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کے مابین "چندر بدن و مہیار"، ایسی مشہور مثنوی لکھی۔ فتح نامہ
بکھیری سلطان محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ء — ۱۶۵۵ء) کے زمانے کی ایک جنگ
کے بیان میں ہے جو ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں واقع ہُوئی۔

[مخطوطات انجمن ترقی اُردو، ایضاً، ص ۳۴۸]

۱۱ے تاریخ سکندری (اشعار: ۵۵۴) میں نصُرتی نے علی عادل شاہ ثانی کے جانشین
سکندر عادل شاہ کی تخت نشینی کے سال (۱۶۷۲ء) پیش آمدہ واقعات نظم کیے ہیں۔
تفصیل کے لیے دیکھیے: نصُرتی، بابائے اُردو، ۱۹۴۴ء

۱۲ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۷۴

۱۳ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۴۸

۱۴ے اُردو تنقید پر ایک نظر، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۹

۱۵ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۵۶ - ایک دوسری جگہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"مرزا (دبیر) صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف
پائے جاتے ہوں لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا۔"

[موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۸۰]

۱۶ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۷۴

۱۷ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۷۳

۱۸ے الفاظ کی صحت کے متعلق جن اعتراضات کو بابائے اُردو نے تسلیم نہیں کیا، وہ خود
مولانا شبلی کے عائد کردہ ہیں، نساخ کے نہیں۔ شبلی کے الفاظ یہ ہیں:

"نساخ نے بہت سے صحیح اعتراضات چھوڑ بھی دیے ان کی تفصیل ذیل میں ہے۔۔" (موازنہ، ص ۲۴۸)

"تفصیل" کے تحت مولانا شبلی نے میر انیس کے بارہ اشعار پر اعتراضات کیے ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میر انیس کے کلام میں "اس قسم کی اور بہت سی غلطیاں ہیں" —— (موازنہ، ص ۲۴۹)، انہی بارہ "غلطیوں" میں سے چار کے ماننے میں بابائے اُردو کو تامل ہے۔

۱۹ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۸

۲۰ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۸

۲۱ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۸

۲۲ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۹

۲۳ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۴۹

۲۴ے موازنہ انیس و دبیر، ایضاً، ص ۲۵۰

"باغ و بہار" کا تنقیدی اور کرداری مُطالعہ

"باغ و بہار" کے اِس تنقیدی مُطالعے میں زہرا مُعین نے کرداروں کے تجزیے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ آدمی اِس تجزیے کو اپنا رہنما بنائے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ مُعین نے قصّے کے ظاہر سے گزر کر، اس کے باطن تک رسائی حاصل کی ہے۔ کسی فنّی تخلیق کا ایسا تجزیہ جو اُسے پہلے سے زیادہ اہم بنا دے، اُسے بہترین تجزیاتی مُطالعہ کہنا چاہیے اور زہرا مُعین کی یہ کتاب اس علمی، ادبی اور نفسیاتی ضرورت کو قابلِ تحسین انداز میں پورا کرتی ہے —

—— سیّد وقار عظیم

مُحترمہ زہرا مُعین نے "باغ و بہار" کا ایک بالکل نئے انداز میں تنقیدی اور کرداری مُطالعہ پیش کیا ہے اور ہر جگہ اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تصنیف "باغ و بہار" کے مُطالعات میں ایک بڑا وقیع، بہت جاندار اور قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔

—— میرزا ادیب

زہرا مُعین، اِسلامیہ کالج برائے خواتین، لاہور میں اُردو کا درس دیتی ہیں۔ شاعرہ اور ادیبہ، دونوں حیثیتوں سے جانی پہچانی ہیں۔ اُنہوں نے جب کچھ لکھا ہے، پوری چھان بین اور احتیاط سے لکھا ہے، ذمّہ داری اور اعتماد کے ساتھ لکھا ہے۔ "باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ" زہرا مُعین کا بھرپور تنقیدی اور تحقیقی کام ہے۔ "باغ و بہار" کے کرداروں کا اب تک پوری طرح تحقیقی و تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا تھا، اِس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی۔ زہرا مُعین نے "باغ و بہار" کا مُطالعہ جس زاویۂ نظر سے کیا ہے، وہ بالکل انفرادی ہے۔ اُنہوں نے بعض ایسی راہوں کی نشاندہی کی ہے جن سے لوگ اب تک بے خبر تھے۔

—— ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اِس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ میر امّن پر اب تک جو کام ہو چکا ہے، زہرا مُعین نے اُس سب کو نظر میں رکھا ہے اور اس پر بیشتر عمدہ محاکمہ کرکے اپنی الگ رائے قائم کی ہے اس لحاظ سے یہ میر امّن کے مُطالعے کے کچھ نئے گوشے سامنے لاتی ہے۔ افسانے کی اہمیت کے اس دور میں یہ کتاب اہلِ ادب پر "باغ و بہار" کی نئی اہمیت بخوبی واضح کرے گی۔

—— انور سدید

ضخامت: ۳۳۲ صفحات

قیمت: ۱۲ روپے

سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب جس سلیقے اور قرینے، ہمت و حوصلے، جوش و خلوص اور معیار و رفتار سے ادب کی آبیاری کر رہے ہیں، وہ قابلِ رشک ہے۔ "ذکرِ عبدالحق" ان کا تازہ کارنامہ ہے اور ہر آن داد کا مستحق۔

——— پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب کی کتاب "ذکرِ عبدالحق" میری دانست میں اوّل سے آخر تک اُس فرد کی حیاتِ صادقہ کا بے داغ آئینہ ہے جس نے اُردو کو زندہ رکھا، جس نے ہمیں اِس قابل بنانے میں اپنے جان و ایمان کی بازی لگائی کہ ہم آج اُردو کے اہلِ قلم کہلاتے ہیں۔

اِس کتاب کا مطالعہ بار بار کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ مولوی عبدالحق: شیخ سر عبدالقادر، سیّد راس مسعود، جناب حبیب الرحمٰن شروانی ایسے اکابرِ ملّت کے درمیان اُسی طرح وقفِ گفت و شنید ہیں جس طرح مجھے بارہا انکی دید کا شرف حاصل ہوا کرتا تھا۔ اورنگ آباد، نظام آباد، حیدر آباد، دہلی، علی گڑھ، لاہور، سری نگر، کوئٹہ اور پھر تقریباً ہر ہفتے عشرے کراچی میں میری اُن کی اُستادانہ اور شاگردانہ صحبتیں، یہ کتاب میرے سامنے لے آئی ہے ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب کا یہ احسان میرے لیے اِس کُہنہ سالی میں توانائی اور بحالی کا سامان ہے۔

——— ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری